مولانا آزاد کے فکری و عملی

تضادات

مصنف: عارف گل

ماخذ: www.daanish.pk

فہرست

مولاناابوالکلام آزاد کی تحریریں: نقد و نظر کی کسوٹی پر

کچھ عرصہ پہلے فیس بک پر مولاناابوالکلام آزاد کے متعلق چند باتیں لکھنے کا اتفاق ہوا تھا جن میں مولانا آزاد کی تحریروں میں موجود تضادات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ یہ تضادات سوالات کی صورت میں مولانا کے چاہنے اور ماننے والوں کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے اور انکے جوابات کا تقاضا کیا گیا تھا۔ مگر کہیں سے بھی تاحال کوئی جواب نہیں موصول ہوا۔ ہاں بعض باتوں کے حوالے سے مجھے تنقید کا نشانہ ضرور بنایا گیا۔ اب بھی جب کبھی فیس بک پر ابوالکلام کے حامیوں سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ مولانا آزاد کے تضادات سے پہلو تہی کرتے ہوئے صرف مولاناآزاد کی رٹی رٹائی نام نہاد ''پیش گوئیوں'' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ چند دنوں سے بعض دوستوں کا تقاضا تھا کہ میں مولاناابوالکلام آزاد سے متعلق اپنے بکھرے ہوے سوالات کو یک جا کر کے مفصل بیان کردوں۔ تاکہ کوئی صاحب ان کا جواب لکھنا چاہیں تو ان کے سامنے تمام باتیں رکھ دی جائیں۔ اسی بات کے مدنظر میں نے مولاناآزاد کی تحریروں میں موجود تضادات اور نادرست بیانیوں کو سلسلہ وار مضامین کی صورت میں رقم کردیا ہے۔ مولاناآزاد کے اپنے بیان کردہ کسی بھی واقعہ کارد عموماً انکی اپنی دوسری کسی تحریر سے کیا گیا ہے۔ کسی ناگزیر وجوہ سے کسی دوسرے مصنف کی تحریر کا حوالہ دیناپڑا تو وہ بھی دیا گیا۔ مولاناابوالکلام آزاد کی جو کتب میرے پیشِ نظر رہی ہیں ان میں ''تذکرہ''، ''آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی'' بہ روایت عبدالرزاق ملیح

آبادی، ''آزادی ہند'' شامل ہیں۔۔یعنی ''خطباتِ آزاد''، ''غبارِ خاطر''''خطوطِ آزاد'' کوئی صاحب میرے دیئے گئے حوالوں کوچیک کرناچاہیں توانہیں زیادہ محنت نہیں کرناپڑیگی بس یہی چھ کتب اپنے سامنے رکھ لیں۔

سلسلہ مضامین کوپڑھنے سے پہلے میں ضروری سمجھتاہوں کہ کچھ گزارشات پڑھنے والوں خدمت میں پیش کردوں اورامید کرتاہوں کہ جو صاحب اٹھائے گئے سوالات کاجواب دیناچاہیں گے یا مجھ پر تنقید کرناچاہیں گے توانہیں ضرور مد نظر رکھیں گے۔ان سوالات میں سے بعض سوالات واعتراضات ایسے بھی ہیں جو مجھ سے پہلے بھی بڑے صاحبانِ علم بزرگوں نے اٹھائے تھے اور بعض سوال توخود مولاناآزاد کی زندگی میں ہی اٹھائے جانے لگے تھے۔ مگرنہ توان کاجواب مولاناآزاد نے خود دیااورنہ ان کے بعدان کے مریدین خاص کرغلام رسول مہر، عبدالمجید سالک یاشورش کاشمیری نے دینیکی کوشش کی۔ بعض باتوں کاجواب غلام رسول مہر نے دوتین مضامین میں دینے کی کوشش فرمائی جس کاذکراپنے مقام پرآئیگامگریہ جوابات کم اور سوالات اٹھانے والے فردپر تنقید زیادہ تھی۔ انہی تضادات کوسامنے رکھتے ہوے جب میں نے مولاناآزاد کی مذکورہ بالاکتب کامطالعہ کیا تونہ صرف مولاناآزادپر تنقید کرنے والے بزگوں کے بیانات کی تصدیق ہوئی بلکہ اور بھی کئی نئے انکشافات ہوے لٰہذامیں نے اپنے موجودہ سلسلہٗ مضامین میں تمام نقات کو یکجاکر دیاہے۔

مجھے مولانا ابوالکلام آزاد سے نہ تو کسی قسم کا بغض ہے اور نہ ہی عناد۔ میں ایک زمانے میں مولانا کا زبردست مداح رہا ہوں ۔اوران کی تحریر کا آج بھی مداح ہوں خاص کر ''غبارِ خاطر''ان کتابوں میں سے ایک ہے جسے میں نے بار بار پڑھا ہے۔ ان کی تحریر کا سحر آج بھی مجھ پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ان کی علمیت،ذہانت اور آزادی کی تحریک میں ان کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ میں مولانا ماہر القادری کے اس تبصرے سے بالکل متفق ہوں کہ ''مولانا ابوالکلام آزاد کی ذہانت و عبقریت اپنی جگہ مسلم ہے۔ کوئی شک نہیں وہ غیر معمولی ذہین آدمی تھے۔اور وہ جو مشہور کہاوت ہے کہ ''یک من علم را دہ من عقل باید''تو یہ ضرب المثل ان پر پوری اترتی ہے۔ مولانا آزاد تحریر و تفسیر میں اپنا جواب آپ تھے۔ اپنے اندازِ تحریر کے موجد بھی اور خاتم بھی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں وہ صفِ اول کے قائدین میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔انگریزی عہد میں بار بار جیل گئے اور قید و بند کے شدائد ان کی علمیت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔''مگر اس سب کے باوجود تاریخ نویسی،اپنے اور اپنے خاندان کے حالات لکھتے ہوئے جسقدر غلو اور تضاد بیانی انہوں نے کی اس میں بھی وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ایک جگہ کچھ لکھتے ہیں تو دوسری جگہ اس کے الٹ،خود ہی ایک بت بناتے ہیں اور خود اسے پاش پاش کر دیتے ہیں۔ مولانا کے اس رخ پر بھی جو تبصرہ مولانا ماہر القادری نے کیا میں اس سے متفق ہوں کہ ''مولانا آزاد کی تمام خوبیوں کا ہمیں اعتراف ہے مگر ان کی زندگی کے یہ کمزور پہلو بھی ہمارے سامنے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں، تعلیم و سفر وغیرہ اور اپنے خاندان کے حالات

جب بیان کرتے ہیں، تواس میں نہ صرف یہ کہ بیجا مبالغہ سے کام لیتے ہیں بلکہ اس میں ''ایجاد بندہ'' کا خاصہ رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ انہیں اوراپنے خاندان کی تذکرہ نگاری کے فن میں وہ اپنے وقت کے ''واقدی'' ہیں۔ کاش مولانا آزاد جیسا شخص اس مرض میں مبتلا نہ ہوتا۔''

اگرچہ غلام رسول مہر صاحب نیمولانا آزاد کے تضادات کا جواب دینیکی کوشش فرمائی تھی مگر وہ بنیادی اشکالات جو مولانا آزاد کی تحریروں نیپیدا کر دیئے تھے، سے صرف نظر کر گئے۔ لگتا ہے ان کے پاس ان کے جواب تھے ہی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ '' بالفرض مولانا آزاد کے آباواجداد علم وفضیلت کے مالک نہ تھے۔ کیا پاکستان وہند کے ہزاروں نجیب الطرفین سید یا نسب وخاندان کی برتری کے دوسرے استخوان فروش یاخود یہ محقق مل کراور متحد ہوکر ''الہلال''، ''البلاغ''،'' تذکرہ'' ''قولِ فیصل''، ''غبارِ خاطر'' یا ''ترجمان القرآن''، جیسی ایک بھی چیز پیدا کر سکتے ہیں۔ پھر ہمارے دور میں حضرت علامہ اقبال اسلام کے بہت بڑے داعی اور ترجمان تھے اور یہ معلوم ہے کہ ان کے جد امجد مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ قائد اعظم مرحوم کا خاندان بھی کچھ عرصہ پیشتر مسلمان ہوا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ومغفور خود دائرہ اسلام میں آئے۔ کیا کوئی شخص یہ جرات کر سکتا ہے کہ انکے کارناموں کی تحقیر کیلیے انہیں نومسلم قرار دیا جائے۔ یقیناً شرف وعزت نسب وخاندان نہیں بلکہ ہر انسان کیحسنِ عمل اور ذاتی کارناموں میں ہے'' بجا ارشاد ہے۔ بلاشبہ مولانا آزاد کی عظمت ان کی اپنی قابلیت وذہانت اوران کے عمل کی وجہ سے ہے۔

پھر مولانا کو اسلاف کے کارناموں اور خاندانی عزت و عظمت کے سہاروں کی ضرورت بھی نہیں۔ مگر کیا کیا جائیکہ خود مولانا اازاد نے ان ''سہاروں''، ''اضافوں''اور ان افسانوی واقعات'' کی ضرورت محسوس کی۔اب یہ سہارے یا اضافے اگر تاریخ کی کسوٹی پر پورے نہ اتریں تو اس میں ہمارا کیا قصور۔

۔ سوال ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد پر ہی یہ تنقید کیوں ؟ میں کہتا ہوں مولانا اازاد پر کیوں نہیں ؟ اسلامی تاریخ میں اہم سے اہم شخصیتوں اور محترم سے محترم ہستیوں پر نقد واحتساب کا سلسلہ جاری رہا۔ مشاہیر کے حالاتِ زندگی، سفر وسیاحت، تعلیم، تصانیف وتالیف کا جائزہ اوران پر نقد و نظر، کسی مورخ کی حاشیہ آرائیوں اورافسانہ طرازیوں پر تبصرے ہر دور میں ہوتے رہے۔ محدثین کی روایتوں کی صحت وعدم صحت کا تعین کیا جاتا رہا تو پھر کیا مولانا آزاد ہی کی شخصیت پوری امت میں ایسی منفرد،انوکھی اور مقدس ہے جن کی تحریر و تقریر، تذکرہ وحالات اور بیانِ واقعات پر نقد و تبصرہ گناہ ہے۔ وہ اپنے سفر، تعلیم، اسلاف کےحالات اور سیاسی مخالفین کے متعلق جو بھی بیان کردیں اس پر لب کشائی کی اجازت نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو کچھ اپنے قلم سے خود لکھ دیں یا ان کی زبانی دوسرے لوگ اپنی کتابوں میں بیان کردیں ان کو درست ہی مانا جائے۔ اگر مولانا کے اپنے بیانات میں تضاد ہو یا واقعات کی تصدیق دوسرے ذرائع نہ کریں تو اس کا قلم سے اظہار نہ کیا جائے۔

مولاناآزاد کی اوپر دی گئی چھ کتابوں میں سے دو ''آزاد کی کہانی''اور ''آزادی ہند'' باقی کتب سے مختلف ہیں۔ یہ کتب مولاناآزاد نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی تھیں بلکہ مولانا نے انہیں اپنے ساتھیوں کو املا کرایا تھا۔ پھر یہ کس طرح مولانا کی ہیں ذرااس کاتذکرہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ کل کلاں کسی صاحب سے میرے ان کتابوں کے دیئے گئے حوالوں کا جواب نہ بن پڑے تو وہ اس سے انکاری ہی نہ ہو جائیں۔

الف)''آزاد کی کہانی'' بہ روایت عبدالرزاق ملیح آبادی کے متعلق عبدالرزاق ملیح آبادی رقم طراز ہیں ''ازاد کی کہانی'' کی شانِ نزول یہ ہیکہ 1921 میں ہم سب جیل کے چرند پرند بن چکے تھے۔ جیل کی عجیب زندگی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو جیل میں رہ چکے ہیں۔اکتاڈالنے والی زندگی اور ہم سیاسی قیدی تھے اور اے کلاس ہیں کوی کام کرنیکا نہ تھا۔ میں نے مولانا کواکسانا شروع کیاکہ ''تذکرہ''کی دوسری جلد لکھا دیں۔ ہفتوں ''میرے بھائی''''میرے بھائی'' کہہ کرٹالتے رہے مگر میں بھلا پیچھا چھوڑنے والا تھا۔ تقاضاجاری رکھا۔آخر راضی ہو گئے اور یہ کتاب لکھاناشروع کردی۔ بولتے جاتے تھے اور میں پینسل گھسیٹتا جاتا تھا۔رات کو مسودہ صاف کرلیتا تھا۔''

یقیناً مولاناآزاد اگر یہ کتاب اپنے ہاتھ سے لکھتے تو اس کی شکل مختلف ہوتی۔ مگر یہ کہنا بھی درست نہیں ہو گا کہ یہ تمام کی تمام مولاناآزاد کی بیان کردہ نہیں پھر فاضل مرتب پر بھی یہ اتہام لگانا زیادتی ہو گی کہ اس نے کتاب چھاپتے وقت اپنی طرف سے کچھ بڑھادیا ہو گا۔ فاضل مرتب مولانا کے عقید تمند اور 37 سال ساتھی رہے۔وہ مہینوں مولانا کے گھر میں

بھی رہتے رہے۔ یہاں تک کہ مولانااازاد نے ان کے متعلق لکھا ''مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم وارشادِ سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ جو طالب صادق اُنکے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔انہوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔''اب ایسے مرید کیمتعلق جو خلیفہ مجاز بھی ہو یہ سمجھنا کہ اس نے اپنے پیر سے غلط باتیں گھڑ کر منسوب کردی ہوں گی کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ ہوسکتاہے چونکہ مولانا نے یہ کتاب جیل میں بغیر کسی مآخذ کو سامنے رکھ کر لکھوائی لہذا کہیں ناموں میں اختلاف آگیا ہو، کہیں سنین بھول گئے ہوں یا کہیں جزئیات میں کمی بیشی ہوگئی ہو۔ایسا ہونا ممکن ہے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم کہیں کہ فلاں واقعہ مولانا نے بیان ہی نہیں کیاہوگا۔ اسی لیے میں نے اپنے آئندہ کے سلسلۂ مضامین میں ایسے تمام واقعات سے صرف نظر کیاہے جن کا تعلق ناموں، سنین یاواقعات کی جزئیات سے تھا۔

ب)''آزادی ہند''اصلاًانگریزی میں چھپی تھی۔ جس کے تیس صفحات تیس سال کے لیے روکے گئے تھے۔ مکمل کتاب 1988 میں چھپی تھی جبکہ نامکمل ایڈیشن 1958 میں آیا تھا۔کتاب کے مرتب ہمایوں کبیر بھی مولانا کے ساتھی رہے تھے۔ وہ اس کتاب کی کہانی یوں بیان کرتے ہیں۔''میں نے مولانا آزاد سے گزارش کی کہ وہ اپنے سوانح حیات لکھوادیں۔ پہلے تو وہ ہچکچاے اور پھر تیار ہوگئے۔ میں جب دہلی سے باہر نہ ہوتاتو روزانہ ڈیڑھ سے دو گھنٹے مولانا کے یہاں چلے جاتا۔ وہ جو کچھ فرماتے تھے میں اس کے اچھے خاصے

مفصل نوٹ لے لیتا تھا بعض نکات کی توضیح یا مزید معلومات بروئیکار لانیکی غرض سے سوال بھی کرتا جاتا تھا۔اس طرح ایک باب کے لیے خاصا مواد فراہم کرلیتا تو اس کی بناپر انگریزی مسودہ تیار کرکے موقع پر مولانا کے حوالے کر دیتا۔ وہ ہر باب خود پڑھتے پھر ہم دونوں یکجا بیٹھ کر اسکا جائزہ لیتے۔ اس مرحلے پر مولانا بہت سی ترمیمیں کرادیتے جو مطالب میں اضافے یا تغیر یا حذف پر مبنی ہوتیں۔ یہ سلسلہ جاری رہتا تاآں کہ میں نے ستمبر 1957 میں کتاب کا پورا مسودہ انکے حوالے کر دیا۔ مولانا نے اس میں سیتیس صفحے نکال کر اور مہریں لگوا کر نیشنل لائبریری کلکتہ اور نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں محفوظ کرادیے۔ ان صفحات کے نکل جانے سے اصل کتاب کے مطالب میں کوئی خلل یا خلا پیدا نہ ہوا۔ باقی مسودہ مختلف ترمیمات اور نظر ثانی کے بعد اواخر نومبر 1957 میں مولانا کے پاس پہنچ گیا۔ 26 جنوری 1958 کو یعنی انتقال سیصرف اٹھائیس روز بیشتر مولانا نے اسے چھاپ دینیکی اجازت دیدی۔" اس تفصیل کے بعد کوئی یہ نہیں کہ سکتا کہ "آزادی ہند" مولانا آزاد کی تصنیف نہیں یا اس میں بیان کیے گئے حالات وواقعات تمام وکمال مولانا کے نہیں۔

آگے پیش کئے گئے سلسلہ مضامین میں میرا طریقہ یہ رہاہے کہ میں نے کسی فرد یا واقعے سے متعلق مولانا آزاد کا کوئی بیان ان کی کسی کتاب سے لیا اور پھر مولانا کی کسی دوسری کتاب سے مختلف بیان لیکر درج کر دیاہے اس طرح تضاد واضح ہوگیاہے یا پھر مولانا کے بیان کردہ ایسے واقعات لکھ دیئے ہیں جن کی تردید تاریخ وسوانح کی مستند ترین کتب سے ہو جاتی

ہے۔اورآخری بات یہ کہ یہ تمام مضامین لکھنے کا مقصد صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ جب مولانااپنے یااپنے اسلاف کے کارناموں کے بیان میں ''ایجادبندہ'' سے کام لے سکتے ہیں توپھرانہوں نے اپنے مخالفین خاص کر قائدِاعظم اور مسلم لیگ کے متعلق لکھتے یابولتے ہوئے کیاکیاکچھ زیب داستاں کیطورپر بڑھانہیں دیاہو گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے کچھ خاندانی حالات

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اسلاف اور خاندان کے مفصل حالات اپنی کتاب ''تزکرہ'' اور ''آزاد کی کہانی'' میں مفصل اور مختصراً اپنی کتاب ''آزادی ہند'' کے پہلے باب میں بیان کر دیئے ہیں۔ یہ احوال و بیانات یا تو باہم متعارض ہیں یا پھر ان کی تصدیق تاریخ و سوانح کی مستند کتب سے نہیں ہوتی اور بعض صورتوں میں تو دوسرے ماخذ مولانا کے بیان کی تکذیب کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بتادینا بھی ضروری ہے کہ ایسی تنقید و تحقیق کی چھانی میں آنے والی مولانا آزاد کی ہی واحد شخصیت نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس طرح کی تحقیقات جید علماء، نامور مورخوں، فاضل فقہاء، قابل قدر محدثین، سوانح نگاروں غرض ہر لکھنے والے کے متعلق کی گئیں۔ کتابوں، مقامات، ماہ و سال، خاندانی شجروں، سیر و سیاحت کے حالات اور سوانحی خاکوں میں موجود غلط نسبتوں کی تحقیق ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ کتابوں میں مندرج واقعات اور افراد کے احوال کو کھنگالا جاتا رہا ہے۔ تو پھر مولانا ابوالکلام آزاد ہی کے بیان کردہ سوانح و احوال کی تحقیق کیوں ''اعجوبہ'' قرار دی جائے۔ تحقیق کا جواب تحقیق سے اور دلیلوں کا مقابلہ دلیلوں سے کیا جانا چاہیے۔ مولانا آزاد کے کسی معترض کے اعتراض کا معترضہ جملہ صرف اور صرف کسی مستند حوالے پیش کر کے ہی رد کیا جانا چاہیے۔

مولانامنورالدین

مولانامنورالدین مولاناآزاد کے والد مولاناخیر الدین کے ناناتھے۔ مولاناآزاد نے ان کی نسبت "تذکرہ" میں لکھا۔ "والد مرحوم کے نانا رکن المدرسین مولانا منورالدین اپنے عہد کے مشاہیر اساتذہِ علم و درس اور اصحابِ طریقت و سلوک میں سے تھے۔ ان کا شمار حضرت عبدالعزیزؒ کے اجل تلامذہ میں تھا۔ وہ سلطنتِ مغلیہ کے آخری "رکن المدرسین" تھے۔ ان کے شاگردوں اور مریدوں میں ایسے اربابِ کمال ہوئے۔ جو اپنے عہد کے ممتاز بزرگوں میں شمار کئے گئے"۔ پھر "آزادی ہند" میں ان کی نسبت لکھا۔ "میرے والد کے نانا مولانا منورالدین تھے۔ وہ مغلیہ دور کے "رکن المدرسین" کا خطاب پانے والے آخری لوگوں میں سے تھے۔ یہ منصب شاہجہاں کے زمانے میں وضع کیا گیا تھا۔ اس عہدے کا موازنہ آج کے ڈائریکٹر تعلیمات کے عہدے سے کیا جاسکتا ہے۔

"میرے داداکا جب انتقال ہواتواسوقت میرے والد مولاناخیر الدین بہت کم عمر تھے۔ اسلیئے میرے والد کی پرورش ان کے نانا نے کی۔ غدر سے دو برس پہلے ہندوستان کی صورتِ حال سے دلبرداشتہ ہوکر مولانامنورالدین نے مکہ معظمہ کو ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھوپال پہنچے تونواب سکندرجہاں بیگم نے انہیں روک لیا۔ وہ ابھی بھوپال ہی میں تھے کہ غدر کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ پھر دوبرس تک وہاں سے نکل نہ سکے۔ اس کے بعد وہ بمبئی گئے لیکن مکہ معظمہ نہیں پہنچ سکے کیونکہ بمبئی ہی میں ان کاانتقال ہوگیا"۔ پھر "آزاد کی کہانی"

میں مولانا منور الدین کے حالات کافی تفصیل سے درج ہیں۔ ہم یہاں صرف ان حصوں کو درج کریں گے جن پر اشکالات پیدا ہوتے ہیں اور جو حقیقت سے زیادہ افسانوی رنگ لیے ہوئے ہیں مولانا فرماتے ہیں''۔ مولانا منور الدین نے ابتدائی تعلیم علمائے لاہور سے حاصل کی۔ 15 یا 16 سال کی عمر میں گھر سے نکلے دہلی پہنچے اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہو گئے۔ ان کے ہم درس مولوی رشید الدین، مولوی برہان الدین، مولانا اسماعیل شہید، شاہ احمد سعید اور مولانا شاہ احمد سعید اور مولانا محمد وجیہہ وغیرہ تھے اور ہر جماعت شاہ صاحب کے اولین حلقۂ تلامذہ کی تھی۔

''تکمیل کے بعد خود اپنا حلقۂ درس قائم کیا جو تھوڑے ہی عرصے میں اتنا مشہور ہو گیا کہ بنگال اور دوسرے اطراف ہند سے طلبہ آ کر فیض یاب ہونے لگے۔ ان کے مشاہیر تلامذہ میں ''مولانا سدید الدین'' جن کی اعانت سے لارڈ ہسٹینگز نے مدرسہ عالیہ کلکتہ قائم کیا اور یہ اس کے پہلے پرنسپل ہوئے۔ ''مولوی محبوب علی'' جو غدر سے پہلے دلی کے مشہور عالم تھے۔ ''مولوی فضل امام'' جو مولوی فضل حق خیر آبادی کے والد تھے۔ ''مولوی فضل رسول بدایونی'' اور ''مولوی محمد علی'' صاحب کشاف اصطلاحات الفنون شامل ہیں۔'' یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا منور الدین لاہور سے آئے تھے۔ وہ دہلی میں غریب الدیار تھے تو انہوں نے کیسے اور کس جگہ دہلی میں اپنا حلقۂ درس قائم کیا تھا۔ پھر جب ''تذکرہ'' کے بیان کردہ اس اجمال کہ ''انکے شاگردوں اور مریدوں میں ایسے ارباب کمال ہوئے جو اپنے عہد کے ممتاز بزرگوں میں شمار کیے گئے'' کی تفصیل

’’آزادی کی کہانی‘‘ میں مندرجہ بالا ناموں کے اظہار سے ہوتی ہے تو پھر عجیب صورتِ حال کا سامنا ہوتا ہے۔ جب ہم تحقیق کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان اصحاب میں سے کوئی بھی مولانا منورالدین کا شاگرد نہیں تھا۔ ان تمام اصحاب کے تذکرے مختلف کتب میں موجود ہیں مگر ان کے اساتذہ میں مولانا منورالدین نام کا کوئی عالم موجود ہی نہیں۔ بلکہ مولانا فضل امام تو مولانا منورالدین سے عمر میں بھی بڑے تھے۔ جس دود کی دہلی کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اسوقت دہلی میں دو مدرسے اپنے خاص علوم کی وجہ سے معروف تھے۔ منقولات میں شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ اور معقولات میں مولانا فضل امام کا۔ وہ عالم جو مولانا منورالدین کے استاد کے ہم عصر ہوں وہ ان کے (مولانا منورالدین کے) شاگرد کیسے ہو سکتے ہیں۔ ’’آزاد کی کہانی‘‘ میں آگے بیان کیا جاتا ہے۔ ’’بالآخر جب ان کی (مولانا منورالدین کی) شہرت بہت ہوئی اور علم کے علاوہ سلوک و طریقت میں بھی مشہور ہوئے تو شاہ عالم ثانی کے عہد میں ان کو مغلیہ سلطنت کا ’’رکن المدرسین‘‘ بنایا گیا۔ سلطنتِ مغلیہ میں علمِ پیشوائی کے چار سب سے بڑے خطاب تھے جو حکومت کی جانب سے دیے جاتے تھے۔ (1)’’ملک العلماء‘‘ سب سے بڑے عالم کو دیا جاتا تھا۔ (2)’’نقیب الاولیاء‘‘ صوفی صاحبِ طریقت کو، (3) ’’ملک الاطباء‘‘ شاہی طبیب کو اور (4) ’’رکن المدرسین‘‘ سب سے بڑے صاحب درس و تلامیذ عالم کو۔ یہ صرف خطاب ہی نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ بہت بڑے منصب بھی وابستہ تھے۔ تمام علماء کا دربار سے تعلق ملک العلماء کے توسط سے ہوتا تھا۔ تمام اصحابِ طریقت کا نقیب الاولیاء کے ذریعہ سے، تمام

اطباء کا ملک الاطباء کے ذریعہ اور اسی طرح تمام اصحابِ درس و تعلیم کا رکن المدرسین کے ذریعہ۔ ''رکن المدرسین'' اس عہد میں ایک طرح کی وزارتِ تعلیم تھی۔''

یہاں پہنچ کر میں اپنے قارئین کو روک کر ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ہر کتاب اور بیان میں اپنے والد کے نانا مولانا منورالدین کو مغلیہ عہد کا آخری ''رکن الدرسین'' بتایا ہے تو کیا ''رکن المدریسین'' نام کا کوئی عہدہ یا خطاب واقعی میں تھا بھی جو حکومت کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ مغلیہ دور پر لکھی گئی کوئی کتاب اٹھا لیجیے آئین اکبری، مآثرالامراء، مآثرِجہانگیری، شاہجہاں نامہ پڑھ ڈالیے کہیں بھی اس نام کے عہدے کا ذکر نہیں ملے گا اور نہ ہی باقی تین عہدوں ''ملک العلماء''، ''نقیب الاولیاء'' اور ''ملک الاطباء'' کا کوئی حوالہ کہیں نظر آتا ہے۔ مغلیہ عہد کے معروف خطاب اور عہدے ''مخدوم الملک''، قاضی القضاۃ'' اور ''صدر الصدور'' وغیرہ آپ کو عام کتابوں میں نظر آجائیں گے مگر کہیں نظر نہیں آتے تو مولانا آزاد کے بیان کردہ مذکورہ بالا چار عہدے یا خطاب۔

ذرا آگے چل کر ''آزاد کی کہانی'' میں بیان کیا جاتا ہے'' مولانا محمد اسماعیل شہید، مولانا منورالدین کے ہم درس تھے۔ شاہ عبد العزیز کے انتقال کے بعد جب انہوں نے ''تقویت الایمان'' لکھا اور اسکے مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے دور میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منورالدین نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں اور 1248ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد کیا۔ ایک طرف مولانا اسماعیل

اور مولانا عبدالحئی تھے اور دوسری طرف مولانا منور الدین اور تمام علمائے دہلی۔ اس معاملے میں مولانا فضل امام خیر آبادی اور دیگر علماء ان کے (مولانا منور الدین کے) شریک و معاون تھے۔ چنانچہ ان کی ایک تصنیف خاص مسئلہ ''امتناعِ نظیر'' پر ہے۔'' یہاں پہنچ کر پھر چند سوال جنم لیتے ہیں۔

جامع مسجد کے جس مشہور مباحثے کا مولانا نے ذکر کیا ہے اس کی روداد مولانا فضل رسول بدایونی کی مرتب کردہ چھپی ہوئی موجود ہے۔ اور یہ مولانا فضل رسول بدایونی وہ ہیں جنہیں مولانا آزاد نے مولانا منور الدین کا شاگرد بتلایا ہے۔ مگر اس روداد میں کہیں بھی کسی مولانا منور الدین نام کے عالم کا ذکر نہیں۔ حیرت ہوتی ہے یہ کیسا شاگرد ہے جو مناظرے کے صدرِ مجلس اور اپنے استاد کا کہیں نام تک بھی نہیں لیتا۔ پھر بتایا گیا ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل کے رد میں ساری سرگرمی مولانا منور الدین کی سربراہی میں ہوئی اور انہوں نے اس حوالے سے متعدد کتابیں لکھیں۔ مگر نہ تو علماء کے کسی تذکرے میں اور نہ سوانح کی کسی کتاب میں مولانا منور الدین کا کہیں ذکر ہے۔ اور نہ ہی مولانا منور الدین نام کے کسی عالم کی کتاب کا کہیں حوالہ ملتا ہے۔ مولانا منور الدین کے شاگرد کی کتاب اس مسئلے پر ''امتناعِ نظیر'' کے نام سے آج بھی موجود ہے مگر نہیں ملتی تو مولانا منور الدین کی کوئی کتاب۔

ذرا آگے چل کر ''آزاد کی کہانی'' میں بیان ملتا ہے۔

''غدر سے پہلے جب مولانا منور الدین ہندوستان کے حالات سے دلبر داشتہ ہو کر اپنے نواسے (مولانا آزاد کے والد) کو ساتھ لے کر حجاز کے لیے روانہ ہوئے۔ جب بھوپال پہنچے تو نواب سکندر جہاں بیگم کا زمانہ تھا وہ ان کا ذکر پہلے سے سُن چکی تھیں۔ انہوں نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا کہ چند دن بھوپال میں قیام فرمائیں۔ بیگم صدقِ دل سے مولانا کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور توبہ کی۔ عیش و نشاط کے محل کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔

''قیامِ بھوپال کے زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ نواب جہانگیر خان جو نواب سکندر جہاں بیگم سے غایت درجہ وابستہ تھا جب مولانا کے ہاتھ پر تائب ہونے کی وجہ سے بیگم کی نظرِ التفات سے محروم ہو گیا تو اس سے سخت حسد و رنج پیدا ہوا۔ اس نے مولانا کو زہر دینا چاہا۔ ایک مرتبہ جب بیگم اور متعدد امراء کھانے میں شریک تھے تو اس نے ایک قاب اٹھا کر مولانا کے سامنے رکھ دی۔ اسی میں درحقیقت زہر تھا۔ مولانا کو کسی طرح معلوم ہو گیا اور انہوں نے وہ قاب اٹھا کر نواب جہانگیر خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا یہ آپ کے کھانے کی چیز ہے۔ نواب پر اس کا ازحد اثر ہوا اور اسے مولانا کی کرامت تصور کیا۔ قدموں پر گر کر توبہ کی۔ پھر یہ حالت ہوئی کہ جوتیاں اٹھا کر پالکی کے ساتھ دوڑتا تھا۔'' ''

ایک طرف یہ بیانات ہیں اور دوسری طرف آپ تاریخِ بھوپال پر کتابیں پڑھ لیجئے کہیں بھی اس قسم کے واقعے کا ذکر نہیں ملے گا۔ نواب سکندر جہاں بیگم کے کسی تذکرے میں اس کا

ذکر نہیں۔ یہاں تک کہ نواب جہانگیر خاں اسوقت جن سالوں کا یہ واقعہ بتایا جاتا ہے اس دنیا میں موجود ہی نہ تھا۔

مولانا مزید فرماتے ہیں۔ ''ایک سال بعد مولانا بھوپال سے بمبئی عازم ہوئے مگر یہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گئے اور اس سال بھی حجاز نہ جا سکے۔ اس قیام کی وجہ سے ان کا اثر صوبہ بمبئی، کاٹھیاوار اور گجرات میں پھیل گیا اور ہزاروں آدمی بیعت ہوئے۔ یہاں دو سال قیام رہا۔ تیسرے سال مکہ معظمہ پہنچے اور پانچ سال میں پانچ حج کر کے وہیں انتقال کیا''۔'

یہاں مولانا فرمارہے ہیں مولانا منور الدین تیسرے سال مکہ معظمہ پہنچے اور پانچ سال میں پانچ حج کر کے وہیں انتقال کیا جبکہ ''آزادی ہند'' میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے لکھا تھا کہ ان کا انتقال بمبئی میں ہو گیا تھا۔ اب اس میں سے کس بات کو درست مانا جائے۔ مولانا منور الدین کا انتقال بمبئی میں ہوا تھا یا مکہ معظمہ میں پانچ حج کرنے کے بعد مکہ معظمہ میں ہی۔

پھر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ مولانا منور الدین نام کی دہلی میں کوئی ایسی شخصیت گذری بھی ہے جس کی یہ امتیازی خصوصیات ہوں۔ جو شاہ عبدالعزیز کا شاگرد ہو، جس کے درس میں سینکڑوں طلباء جوق در جوق آئے ہوں۔ جو ''ڈولے'' کی رسم پر بادشاہ سے ٹکر لے، جو دربار میں شیعوں کے رسوخ پر بہادر شاہ کی سرزنش کرے اور جو وہابیت کے خلاف ہندوستان میں قائدانہ کردار ادا کرے۔ شاہ عبدالرحیم کے مدرسے کو بحال کر کے وہاں مفتی صدرالدین آرزہ کا تقرر کرائے۔ ایسی عظیم شخصیت کے احوال کے لیے حیاتِ

عزیزی، تذکرہ علماء ہند، اس دور کے فتویٰ یہاں تک کہ ''آثار الصنادید'' ہی کو دیکھ لیجئے۔ دہلی میں ہر عالم یہاں تک کہ کم سے کم مشہور عالم کا تذکرہ بھی مل جائے گا۔ اسی مفتی صدر الدین آزردہ کا تذکرہ وہ انتہائی والہانہ تو ہے ہی مگر ان اصحاب کا تذکرہ بھی موجود ہے جنہیں مولانا منور الدین کا شاگرد بتایا گیا ہے مگر نہیں ملتا تو مولانا منور الدین کا تذکرہ۔ آخر ان تذکرہ نگاروں کو مولانا موصوف ہی سے ایسی کیا کد ہو گئی تھی جو انہوں نے صرف مولانا منور الدین کے ذکر اور کارناموں کے بیان سے پہلو تہی کی۔ ان سوالات کے جواب اگر مولانا کے مریدوں کے پاس ہوں تو ہماری تصیح و تشفی کرادیں۔

یہاں ایک خاص بات کی بھی وضاحت کردوں کہ ''آزاد کی کہانی'' اور ''آزادی ہند'' میں بہت سے افراد کے نام غلط لکھے ملتے ہیں۔ بعض واقعات کی تاریخیں درست نہیں اور کہیں کتابوں کا انتساب غلط بیان ہو گیا ہے۔ مثلاً ''امتناعِ نظیر'' مولانا فضل امام خیر آبادی کی بتائی گئی حالانکہ یہ ان کے بیٹے مولانا فضل حق خیر آبادی کی کتاب ہے۔ میں نے اس طرح کی چیزوں پر کوئی تنقید نہیں کی۔ چندماہ قبل جب فیس بک پر مولانا کے بعض متضاد بیانات پوسٹ کیے تھے اور ان کا جواب ابوالکلامیوں سے چاہا تھا تو ایک صاحب یہ کہہ کر بھاگ گئے کہ ان سوالوں کے جوابات مولانا غلام رسول مہر دے چکے ہیں۔ ایسے ابوالکلامیوں سے عرض ہے کہ غلام رسول مہر صاحب نے اپنے تین چار مضامین میں مولانا پر اعتراضات کے جو جوابات دیئے تھے وہ میرے پاس موجود ہیں۔ ان جوابات کا تعلق اسی طرح سنین کے اختلاف، ناموں اور کتابوں کے انتساب اور واقعات کے سالوں میں فرق

سے ہے۔ میں نے جو سوالات اس سلسلہِ مضامین میں اٹھائے ہیں، غلام رسول مہر نے ایسی کسی سوال کا جواب نہیں دیا نہ ہی اسوقت اتنے سوالات اٹھائے جا چکے تھے جو میں نے اٹھائے۔ لٰہذا مولانا مہر صاحب کی طرف سے ان کے جوابات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قارئین کرام یہ سب باتیں نہ تو مولانا آزاد کی ذات پر تنقید کہی جاسکتی ہیں اور نہ ہی ان کے ذریعے مولانا کے کیریکٹر پر کیچڑ اچھالا گیا ہے۔ یہ سب سوال تو مولانا کی اپنی تحریروں نے پیدا کیے ہیں۔ اگر مولانا آزاد ایک جگہ لکھیں کہ مولانا منورالدین حجاز جاتے ہوئے بمبئی میں انتقال کر گئے۔ اور دوسری اس سے مختلف بیان لکھ دیں کہ وہ مکہ معظمہ پہنچے اور پانچ سال میں پانچ حج کر کے وہیں فوت ہوئے، تو یہ تضاد ہم نے نہیں مولانا نے پیدا کیا ہے۔ اگر مولانا فرمائیں کہ مولانا منورالدین مغلیہ عہد کے آخری رکن المدرسین تھے جبکہ تحقیق سے پتا چلے کہ اس نام کا کوئی عہدہ یا خطاب تھا ہی نہیں۔ اگر مولانا فرمائیں کہ شاہ اسماعیل شہید کے مقابلے میں جامع مسجد کے مشہور مناظرے میں مولانا منورالدین تمام علمائے دہلی کے سردار تھے جبکہ تاریخ کی کتابوں سے ایسا کوئی ثبوت نہ ملے۔ اگر مولانا فرمائیں کہ فلاں فلاں علماء مولانا منورالدین کے شاگرد تھے، دوسری طرف تاریخ وسوانح کی کتب اس سے انکاری ہوں۔ اگر مولانا فرمائیں کہ مولانا منورالدین دہلی کی ایسی نادرِ روزگار شخصیت تھے جن کے درس میں سینکڑوں طلباء موجود ہوتے تھے مگر ہندوستان کے کسی تذکرے میں ان کا نام ہی نہ ملے۔ تو پھر قصور کس کا۔

آخری بات کے طور پر عرض ہے میں یہ کہتا ہوں مولانا آزاد کی عظمت ان کے اسلاف کے کارناموں کی وجہ سے نہیں بلکہ انکی ذاتی علمیت اور قابلیت کی وجہ سے تھی اور ہے۔ مگر جب مولانا نے خود اپنے اسلاف کے کارنامے پیش کیے جن میں بیحد مبالغہ آرائی اور غیر ضروری افسانہ طرازی پائی جاتی ہے اور جو نقد واحتساب کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے تو اس کے ذمہ دار بھی خود مولانا ہی ہیں۔ اب یہ باتیں بیان بھی کی جائیں گی اور ان پر نقد و تبصرہ بھی ہوگا۔ اس قسم کے نقد سے نہ تو تاریخ میں پہلے کوئی محفوظ رہا ہے اور نہ ہی مولانا کو الگ رکھا جا سکتا ہے۔

مولاناآزاد کے والد مولانا خیر الدین

مولاناآزاد اپنے والد مولانا خیر الدین کے متعلق ''آزادی ہند'' میں بیان کرتے ہیں۔

''میرے دادا کا جب انتقال ہوا تو میرے والد مولانا خیر الدین بہت کم عمر تھے۔اسی لیے میرے والد کی پرورش ان کے نانا مولانا منور الدین نے کی ۔غدر سے دو برس پہلے ہندوستان کے حال سے دل برداشتہ ہو کر مولانا منورالدین نے مکہ معظمہ کو ہجرت کا فیصلہ کیا۔ میرے والد ان کے ساتھ تھے۔ بھوپال میں قیام کے بعد بمبئی پہنچے لیکن مکہ معظمہ نہیں پہنچ سکے کیونکہ بمبئی میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔اس وقت میرے والد کی عمر تقریباً پچیس برس تھی۔ وہ مکہ معظمہ گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی اپنے لیے مکان بنوایااور شیخ محمد ظاہر وتری کی بیٹی سے شادی کر لی۔ شیخ محمد ظاہر وتری مدینہ کے ایک عظیم عالم تھے۔''

جبکہ ''آزاد کی کہانی'' میں بیان ہوتا ہے۔''میرے والد مولانا خیر الدین 1831ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والدین کا صغیر سنی میں انتقال ہو گیا تھااس لیے نانا کے ہاں پرورش ہوئی۔ جب ان کے نانا(مولانا منور الدین)نے ہجرت کا ارادہ کیا تو یہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ بھوپال میں بھی نانا کے ساتھ تھے۔ وہاں ان کے نانا بیمار ہو گئے۔ دو سال وہیں قیام رہا۔ تیسرے سال نانا کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچے۔ نانا نے پانچ سال میں پانچ حج کیے اور وہیں انتقال کیا۔اس وقت علمائے حرمین میں شیخ محمد ظاہر وتری اور شیخ عبداللہ سراج سب سے بڑے عالم تھے۔ والد مرحوم انہی دو اساتذہ کی خدمت میں رہے اور بالآخر شیخ محمد ظاہر اس درجہ شفقت کرنے لگے کہ کچھ عرصہ بعد اپنی بھانجی سے ان کا عقد کر'' دیا۔

یہ دونوں اقتباس آپ کے سامنے ہیں۔ان میں دو باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔ پہلی یہ کہ آیا مولانامنورالدین بمبئی میں ہی انتقال فرما گئے تھے جیسا کہ ''آزادی ہند'' میں بتایا گیا ہے یا وہ مکہ معظمہ پہنچ کر پانچ حج کرنے کے بعد وہیں فوت ہوئے جیسا کہ ''آزاد کی کہانی'' میں بتایا گیا۔آخر ان میں سے کونسا بیان درست مانا جائے۔دوسری بات یہ کہ آیا مولاناآزاد کی والدہ ''آزادی ہند'' کے بیان کے مطابق شیخ محمد ظاہر وتری کی بیٹی تھیں یا پھر''آزاد کی کہانی'' کے فرمان کے مطابق ان کی بھانجی۔یادرہے یہ سگی والدہ کے رشتے کی بات ہورہی ہے کسی دور کے جاننے والے کی نہیں۔ اتنے بڑے تضادات کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔ ہاں مولاناآزاد کے مریدین ان بیانات میں کوئی تطبیق دے سکیں اوراس عقدے کو سلجھا سکیں تواور بات ہے۔

'''آزادی ہند'' میں مولانافرماتے ہیں۔''میرے والد کی ایک عربی کتاب دس جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی تو وہ بھی پورے عالمِ اسلام میں معروف ہوگئے۔''اسی طرح''آزاد کی کہانی'' میں ارشاد ہوتا ہے۔''اسی زمانے میں علمائے مکہ نے والد مرحوم سے کہا کہ وہابی عقائد کی کتابیں اردو میں ہیں جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتے۔اس طرح والد مرحوم نے ایک کتاب نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھی جوان کی تصانیف میں سب سے بڑی ہے۔یہ دس جلدوں میں ختم ہوئی ہے اور ہر جلد بہت ضخیم ہے۔ایک جلد صرف مقدمے میں ہے۔انتظام یہ کیا گیا کہ کتاب کی تصنیف واشاعت ایک ساتھ ہو۔چنانچہ پہلی جلد جوں ہی تیار ہوئی چھپ گئی۔اسی طرح دوسری جلد بھی۔یہ دونوں مکے کے سرکاری پریس مطبع

میری پریس میں چھپی ہیں۔ لیکن چونکہ اس درمیان میں سفر درپیش آگیااس لیے بقیہ جلدیں نہ چھپ سکیں۔''

حیرت ہوتی ہے کہ کبھی یہ بتایا جاتا ہے میرے والد کی عربی کتاب دس جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی اور کبھی یہ کہ پہلی دو جلدیں مکہ کے مطبع میری پریس میں چھپی تھیں اور بقیہ چھپ نہ سکی تھیں۔ ہو سکتا ہے کوئی صاحب یہ کہیں کہ پہلی بار تو دو جلدیں مکہ سے شائع ہوئی تھیں پھر بعد میں دس کی دس جلدیں اکٹھی مصر سے شائع ہوئی ہوں۔ تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دس جلدوں پر مشتمل عربی کتاب جو مولانا کے بقول ان کے والد کو پورے عالمِ اسلام میں معروف کر دیتی ہے۔ وہ ہے کہاں۔ کسی نے دیکھی یا پڑھی۔ دنیا کی کسی لائبریری کا پتہ جہاں یہ کتاب موجود ہو۔ یا صرف یہ مولانا آزاد کے فکرِ نارسا کی ایسی تخلیق ہے جس کا حقیقت کی دنیا میں نہ کوئی وجود تھا اور نہ ہے۔

آگے چلئے۔ ''آزادی ہند'' میں مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ ''مکہ معظمہ میں لوگوں کے لیے نہر زبیدہ پانی کا خاص ذریعہ تھی۔ اس کی تعمیر خلیفہ ہارون الرشید کی اہلیہ بیگم زبیدہ نے کروائی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نہر کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ میرے والد نے اس نہر کی مرمت کروائی۔ ہندوستان، مصر، شام اور ترکی میں انہوں نے 20 لاکھ کا چندہ جمع کیا اور نہر کی حالت بہتر کروادی۔ اس وقت سلطان عبدالحمید ترکی کے حکمران تھے۔ میرے والد کی خدمات کے صلے میں سلطان نے انہیں درجہ اول کا تمغہ مجیدی عطا فرمایا۔''

اسی طرح ''آزاد کی کہانی'' میں بیان کیا جاتا ہے۔ ''ان کے (یعنی والد صاحب کے) زمانہ قیامِ حجاز کا ایک یادگار اور تاریخی واقعہ نہرِ زبیدہ کی مرمت بھی ہے۔'' اس کے بعد مولانا آزاد نے پوری تفصیل بیان کی ہے کہ کس طرح رقم اکٹھی ہوئی، کیسے نقشے تیار ہوئے اور کس طرح تعمیر مکمل ہوئی۔ ساتھ ہی انہوں نے شریف مکہ کی طرف سے نہر زبیدہ کے لیے جمع شدہ چندہ میں خرد برد کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ اور آخر میں سلطان کی طرف سے تمغہ مجیدی کے اجراء کا ذکر بھی کیا ہے۔

مگر جب ہم محققین کی تحقیق دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نہر زبیدہ کی تعمیر کا کارنامہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی صاحب ''اظہار الحق'' نے سرانجام دیا تھا اور انہیں ہی تمغہ مجیدی درجہ اول عطا ہوا تھا۔

مولانا نسیم فریدی نے دسمبر 1958ء میں الفرقان لکھنو میں اپنی تحقیق سے پتہ چلایا کہ نہر زبیدہ کی تعمیر میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا کردار تھا۔ پھر مولانا ماہر القادری نے بھی ''فادان'' 1960ء میں اسی تحقیق کو درست قرار دیا۔ موجودہ دور میں حکیم محمود احمد ظفر اپنی کتاب ''مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے معاصرین'' میں بھی جدید و قدیم ذرائع سے بتا چکے ہیں نہر زبیدہ کی تعمیر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی تحریک پر ہوئی تھی۔ ان تمام ثبوتوں کے بعد مولانا آزاد کی نہر زبیدہ کی تعمیر کو اپنے والد سے منسوب کرنے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ پھر جب مولانا آزاد ''آزاد کی کہانی'' میں آگے یہ بیان کرتے ہیں کہ ''شریفِ مکہ نے نہر زبیدہ کے فنڈ میں خرد برد کی تھی۔ اس پر میرے والد

نے اس کی رپورٹ حکومت کو کرنا چاہی تو شریف مکہ ان کا جانی دشمن ہو گیا۔ والد مرحوم بتایا کرتے تھے کہ جب شریف کی مخالفت انتہائی درجے تک پہنچ گئی اور ایک دن مجھے خبر ملی کہ شریف نے میرے خلاف اپنی سازشیں پوری طرح مکمل کر لی ہیں۔ پچھلی رات کو طواف کرتے ہوئے میں نے خدا سے دعا کی ''اے معبود! تو بہتر جانتا ہے کہ کون حق پر ہے اور تو نے حق والوں کی نصرت و حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ جوں ہی نمازِ فجر ختم ہوئی میں نے یہ اعلان ہوتے سنا کہ شریف کا انتقال ہو گیا۔'' دوسری طرف ہمیں یہ معلوم ہے کہ نہر زبیدہ کی تعمیر سے مولانا کے والد کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا تو پھر مولانا آزاد کی بیان کردہ اپنے والد کی کرامت کی کیا اصلیت رہ جاتی ہے۔

اسی طرح آگے چل کر ''آزاد کی کہانی'' میں بیان کیا جاتا ہے کہ ''غالباً 1901ء کی بات ہے کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی ان سے ملنے کے لیے کلکتہ آئے جن سے ان کے برابر تعلقات رہے تھے اور بارہا ہم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ شخص بلاشبہ صحیح الاعتقاد ہے۔ لیکن بد قسمتی سے وہ اپنے ساتھ بعض اپنی تصنیف لائے اور چونکہ شیخ احمد دحلان والد کے خاص دوست تھے۔ اس لیے انہوں نے خاص طور پر اپنا ایک رسالہ دیا جو ان کے رد میں لکھا تھا اور اس میں عدم ایمان ابوین آنحضرت ﷺ اور ایمانِ ابو طالب پر زور دیا تھا۔ چنانچہ اس پر کچھ دیر تک والد نے ان کا تعقب کیا کہ آخر وہ ہکا بکا رہ گئے اور خاموش چلے گئے۔ جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اس شخص کے عقیدے میں بھی فتور ہے۔'' ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے۔

ہمیں تلاشِ بسیار کے باوجود بھی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا کوئی ایسا رسالہ نہیں ملا جس میں انہوں نے عدم ایمانِ ابوین آنحضرت ﷺ پر زور دیا ہو اور ایمانِ ابو طالب کو ثابت کیا ہو۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کچھ عرصہ قبل مولانا رضا احمد خاں بریلوی کے فتاویٰ کا مجموعہ 34 سے زائد جلدوں میں چھپا ہے۔ اس میں بہت سی جگہوں پر ایمانِ ابوین آنحضرت ﷺ اور عدم ایمانِ ابو طالب پر زور دیا گیا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے چھپے ہوئے فتوٰوں کے بعد مولانا آزاد کی بیان کی گئی کہانی کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

اسی طرح "آزاد کی کہانی" میں بیان کیا جاتا ہے۔ "اسی زمانے میں یہ ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا کہ شیخ احمد دحلان نے مذہب شافعی کو چھوڑ کر مذہب حنفیہ اختیار کر لیا۔ اس کے باعث بھی والد مرحوم ہی تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ میں دوسرے مذہبی عہدوں کی طرح حجاز کے مفتی و شیخِ حرم کا عہدہ بھی صرف احناف کے ساتھ مخصوص تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ احمد دحلان اس عہدے کے متمنی تھے۔ والد نے ہی انہیں آمادہ کیا کہ وہ شافعیت چھوڑ کر حنفی ہو جائیں، چنانچہ وہ ہو گئے۔"

اس پر کیا کہا جائے۔ شیخ احمد دحلان آج بھی پورے عالمِ اسلام میں جانے جاتے ہیں جبکہ مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین کو مولانا آزاد کی کتاب "آزاد کی کہانی" سے باہر کوئی جانتا تک نہیں۔ نہ ہی شیخ احمد دحلان کے کسی سوانح نگار نے ان کے مسلک کی تبدیلی کا بتایا۔ جبکہ مولانا رحمت اللہ کے تذکرے میں بھی ہے کہ جب وہ مکہ مکرمہ گئے تو ان کی شیخ

دحلان سے ملاقات ہوئی۔ شیخ شافعیت میں ہی درس دیا کرتے تھے۔ پھر نہ معلوم مولانا آزاد نے کیوں افسانوی قصے کی بنیاد پر شیخ احمد دحلان کی شخصیت کو مجروح کیا۔

اسی طرح مولانا آزاد نے جنگِ آزادی 1857ء کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر جانے والے علمائے اہلحدیث کے ستائس رکنی وفد کی مکہ میں گرفتاری اور رہائی کے حوالے سے بھی یہ کہہ کر ان کی شخصیت کو داغدار کیا کہ بجز تین شخصوں کے سب نے تقیہ کیا۔ پوری کتاب میں مولانا آزاد نے اپنے اسلاف کی عظمت ثابت کرنے کے لیے کئی اشخاص کے کردار پر حرف زنی کے نشتر چلائے ہیں۔ اور ان کی شخصیت کو داغدار کیا ہے۔

مولانا آزاد نے تو "تذکرہ" میں لکھا تھا۔ "حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطری ترقی اور قدرتی حقوق کے قیام کے لیے نسب و خاندان کے امتیازِ باطل سے بڑھ کر اور کوئی روک نہیں ہو سکتی۔ یہی چیز ہے جو انسان کو اس کے ذاتی قوتوں کے استعمال اور اس کے ثمرات سے محروم رکھنا چاہتی ہے اور اس خلافِ فطرت راہ کی رہنمائی کرتی ہے کہ ایک شخص کو باوجود استحقاقِ ذاتی مستحقِ شرف سمجھا جائے اور دوسرے کو باوجود استحقاقِ ذاتی محروم کر دیا۔ لیکن افسوس غرورِ نسل و وطن کے بت کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پھر چرا لیے گئے اور نئے نئے بھیسوں میں پھر اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ اب کم سر ملیں گے جو اس نشئہِ باطل سے سر گراں نہ ہوں۔"

'پس الحمدللہ کہ نہ اس کی طلب ہے اور نہ اس پر اعتماد اور نہ نااہلوں کے اس غریبِ عزت اور سرابِ شرف کی ضرورت''

مگر افسوس کہ مولانا آزاد نے اپنے اسلاف اور حسب و نسب پر نہ صرف فخر ومباہات سے کام لیا بلکہ ان کی عظمت میں اضافوں کے لیے افسانوی قصوں سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس طرح وہ خود غرورِ نسل کے بت کی پرستش میں پوری طرح ملوث ہیں اور اس نشئہ باطل سے سر گراں بھی۔

ایک طرف تو مولانا آزاد اپنے والد کے انتقال اور ان کے جنازے کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''کلکتہ میں شاید ہی اتنا مجمع کسی واقعہ پر ہوا ہو جتنا ان کے جنازے پر ہوا۔ ظہر کے وقت یہ واقعہ ہوا اور مغرب کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ گھنٹوں تک صرف لوگوں کے ہاتھوں میں بڑھتا رہا۔ کاندھے پر رکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔'' پھر مولانا یہ بھی بتاتے ہیں کہ کبھی وہ علمائے ازہر سے مقابلہ کر رہے تھے تو کہیں علمائے وہابیہ سے۔ کبھی شریفِ مکہ کے مشیرِ خاص تو کہیں سلطانِ ترکی کے دربار میں باریاب۔ ایسے صاحبِ خصوصیات بزرگ پورے نہیں تو نصف عالمِ اسلام میں تو مقبول ضرور ہونے چاہئیں تھے۔ مگر ان کا نام نہ تو ترک، نہ ہی مصر کے کسی تذکرے میں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے کسی مطبوعہ تذکرے میں بھی ان کا نام نظر نہیں آتا۔

مولاناآزاد کی زندگی کے چند متضاد واقعات

سابقہ مضامین میں ہم نے مولانا کی اپنی تحریروں اور بیانات سے ان کے ان متضاد بیانات و واقعات کا تجزیہ پیش کیا تھا جس کا تعلق مولانا کے اسلاف سے تھا۔اب یہاں ہم مولانا آزاد کی ذاتی زندگی کے چند واقعات پیش کرتے ہیں جو مولانا آزاد اپنی ایک کتاب میں کسی خاص انداز سے بیاں کر گئے۔ مگر بعد میں وہی واقعہ کسی دوسری کتاب میں اس کے بالکل متضاد لکھ دیا۔ یا تو مولانا جان بوجھ کر تضاد پیدا کرتے ہیں یا پھر دوسری بار وہی واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ پہلے کیا کہہ چکے ہیں۔

1 مولانا آزاد نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں اپنے ایک جدی بزرگ مولانا شیخ جمال الدین کے احوال لکھتے ہوئے ان کی عظمت ثابت کرنا تھی اور اکبری دربار کے علماء کو علمائے سو ظاہر کرنا تھا تو اس کے لیے انہیں ملا عبد القادر بدایوانی کی کتاب ''منتخب التواریخ'' کے حوالے درج کرنے تھے۔ مولانا آزاد جانتے تھے کہ اس معاملے میں ملا بدایوانی کو بیانِ واقعہ میں کلی طور پر حق بجانب نہیں سمجھا جاتا۔اس لیے مولانا آزاد ملا بدایوانی کو اس طرح حق بجانب ثابت کرتے ہیں۔ ''بعض خوش اعتقاد بزرگوں کا خیال ہے کہ ملا عبد النبی اور مخدوم الملک کی نسبت ملا عبد القادر بدایوانی نے ''منتخب التواریخ'' میں جو کچھ لکھا ہے اس کو ملا صاحب کی نکتہ چین طبعیت کی بے اعتدالیوں اور معاصرت کے تعصب پر محمول کرنا چاہیئے۔ لیکن ان بزرگوں کو معلوم نہیں یہ باتیں اس دور کے اور واقائع نگاروں نے بھی لکھی ہیں۔

شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ بدایوانی نے کون سی بات لکھی ہے۔ البتہ شاہ صاحب تہذیبِ نگارش وطریقِ احتیاط وعفو پر نظر رکھ کر پردے میں لکھتے ہیں اور بدایوانی اپنے جوشِ حق گوئی واضطرابِ راست بیانی میں کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے۔'' مگر اسی ملا عبد القادر بدایوانی کے متعلق مولانا آزاد نے ''غبارِ خاطر'' کے خط نمبر 17 میں، جہاں انہوں نے انانیت کے مسئلے کو موضوع بنایا ہے، جو یہ لکھا ہے کہ۔ ''بدایوانی کا معاملہ اوروں سے الگ ہے۔ طبقہ عوام کا ایک فرد جس نے وقت کی درسیاتی تعلیم حاصل کر کے علماء کے حلقے میں اپنی جگہ بنائی اور دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کر لی۔ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز ابھرتی ہے تو وہ اس کی بے لچک تنگ نظری، بے روک تعصب اور بے میل راسخ الاعتقادی ہے۔ ہمیں اس کی انانیت نہ صرف بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہے بلکہ قدم قدم پر انکار و تبریٰ کی دعوت دیتی ہے۔''

کہاں یہی ملا عبد القادری بدایوانی تعصب سے پاک اور جوشِ حق گوئی واضطرابِ راست بیانی میں کسی کی پرواہ نہ کرنے والا بتایا گیا تھا اور کہاں یہ حال کہ اسی بدایوانی کو معمولی قوم کا فرد، متعصب، بے لچک، تنگ نظر، چھوٹی انانیت کا نمونہ اور قابلِ انکار و تبریٰ ٹھہرایا جارہا ہے۔ شاید ''تذکرہ'' میں اپنے خاندان کے ایک افسانوی بزرگ کی عظمت دکھلانے کے لیے ملا عبد القادر بدایوانی کی ہمنوائی کی ضرورت تھی لہٰذا اسے قابلِ تعریف ٹھہرایا گیا۔ مگر ''غبارِ خاطر'' میں اس کی انانیت پر حرف بھیجنے تھے تو اسے قابلِ ملامت بنادیا۔ یا پھر مولانا

آزاد ''غبارِ خاطر'' لکھتے وقت یہ بھول گئے تھے کہ وہ اس سے پہلے اسی ملا بدایونی کی کس انداز سے تعریف کر چکے ہیں۔

22۔ مولانا آزاد کے خطوط بنام غلام رسول مہر ''نقشِ آزاد'' کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ان میں ایک ہی واقعے سے متعلق دو مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ جو بنیادی تفاصیل میں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔ مرزا غالب سے اپنی عہدِ طفلی کی غیر معمولی قابلیت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی شاعری کا ایک واقعہ دو مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ مولانا کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا۔اس کے باوجود انہیں یاد نہیں رہا کہ پہلے وہ کیا واقعہ بیان کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے ان دو قصوں میں سے ایک ہی صحیح ہو سکتا ہے۔ دسمبر 1935ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر خان شاہ شوخی کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوتی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں وہ غزل کے لیے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دوں۔ میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی'' یاد نہ ہو شاد نہ ہو'' میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سات شعر کہہ دیئے۔ کہنے لگے اشعار کے تعداد طاق ہونی چاہئے۔ میں نے ایک اور شعر کہہ دیا۔ کہنے لگے صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔''

جبکہ مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ''غالب'' کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

''ایک دن دکان میں بیٹھا تھا کہ نادر شاہ آگئے اور مجھ سے کہنے لگے۔ صاحبزادے میاں آپ کی شاعری کی تو بڑی دھوم ہے لیکن لوگ کہتے ہیں حضرت مولانا کا کلام ہو گا (یعنی والد مرحوم کا)۔ میں نے کہا شاید آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت شاعری نہیں کرتے اور اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ مجھے یہ خبط ہوا ہے تو سخت ناراض ہوں۔ کہنے لگے میاں برا نہ ماننا میں ایک طرح دیتا ہوں دو شعر کہہ کر سنا دو عمر بھر دعائیں دیتا رہوں گا۔ میں نے غالب جیسے استاد کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ بڑی دعائیں لو گے، خوش رہو گے۔ میں نے کہا فرمایئے۔ انہوں نے ایک شعر ''یاد نہ ہو شاد نہ ہو'' سنایا۔ میں نے اسی وقت پانچ چھ شعروں کی پوری غزل لکھ کر دے دی۔

''کہہ نہیں سکتا انہوں نے غزل سن کر کیا تماشا دکھایا، سندر پارٹی کا بازار، شام کا وقت، کاندھے سے کاندھا چھل رہا تھا۔ راہگزاروں نے جو یہ عالم دیکھا تو ٹھٹ کا ٹھٹ لگ گیا۔ پہلے بیٹھے بیٹھے تحسین کی، پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور پکار پکار کر داد دینے لگے اور اس طرح جھوم جھوم کر کہ لوگوں نے سمجھا کہ کوئی دیوانہ رقص کر رہا ہے۔''

دو قصوں میں سوائے ''یاد نہ ہو شاد نہ ہو'' کے کوئی بات بھی مشترک نہیں۔

3۔ سن 1945ء میں مولانا آزاد قلعہ احمد نگر جیل میں تھے جب ان کی اہلیہ بیمار ہوئیں اور ان کا انتقال ہوا۔ مولانا نے اپنی اہلیہ کی بیماری اور ان کے انتقال کا احوال دو جگہوں پر لکھا

ہے اور دونوں جگہوں پر مختلف اور متضاد انداز سے۔ مولانا آزاد نے اپریل 1945 کے ''غبارِ خاطر'' کے خط نمبر 21 میں لکھا۔

''جس دن تار ملا، اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا۔ اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا۔ اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اُس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے گفتگو کی۔ وہ سہ پہر میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومتِ بمبئی کے ایماء پر کی تھی۔''

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ان کے لیے ہر قسم کی آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے آمادہ تھی لیکن مولانا کی بلند ہمتی اور خودداری نے گوارا نہ کیا کہ وہ حکومت کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ مگر اس واقعے کا ذکر ''آزادی ہند'' میں مختلف طریقے پر کرتے ہیں۔ وہاں وہ بیان کرتے ہیں۔

''شروع 1945ء میں مجھے گھر سے خبر ملی کہ وہ (اہلیہ) پھر سخت بیمار ہیں۔اس کے بعد اور خطرناک خبریں آنے لگیں۔ڈاکٹر سخت پریشان تھے اور انہوں نے خود ہی گورنمنٹ کو لکھ دیا کہ مجھے ایک مرتبہ بیوی سے مل لینے دیا جائے کیونکہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے اس خط پر کوئی توجہ نہ دی۔ میں نے وائسرائے کو خط لکھا لیکن ہماری خط و کتابت نامکمل رہی۔ایک دن چیتا خاں (سپرنٹنڈنٹ) دوپہر کے وقت خلافِ معمول آیا اور ایک تار مجھے دیا جس میں میری بیوی کے مرنے کی اطلاع تھی۔ میں نے وائسرائے کو یہ لکھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا آسانی سے مجھے کلکتہ عارضی طور پر منتقل کر سکتی تھی تاکہ میں اس کے مرنے سے قبل ایک مرتبہ اس کو دیکھ سکتا۔اس خط کا کوئی جواب نہ ملا۔''

واضح رہے ''غبارِ خاطر'' والا خط ان کی بیگم کے انتقال کے دو روز بعد لکھا گیا ہے جس میں صرف اپنی خود داری، علو ہمتی اور بے اعتنائی کا اظہار کرنے کے لیے مختلف قصہ بیان کر دیا۔ جبکہ بارہ سال بعد اصل حقیقت ''آزادی ہند'' میں تفصیل سے بیان کی تو اس خودداری اور بلند ہمتی کا کہیں ذکر نہیں۔ شاید اصل حقیقت لکھتے وقت مولانا کو یہ خیال نہ رہا کہ غبارِ خاطر میں وہ کیا لکھ چکے ہیں۔

مولانا کی ذاتی زندگی کے ان واقعات اور اپنے اسلاف کے احوال سے یہی بات بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ مولانا کو اپنے اور اپنے اسلاف کی عظمت، بلند ہمتی اور خودداری کے افسانوی قصے تراشنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔اور پھر بے دھیانی میں اصل حقیقت بھی

عیاں کر بیٹھے ہیں۔ معلوم نہیں یہ سب مولانا کی شخصیت اور نفسیات کا کونسا رخ ہے جو انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

مولاناآزاد کا سفرِ ایران، مصر و عراق

مولاناابوالکلام آزاد نے اپنے بعض خطوط اور کتب میں اپنے سفرِ ایران، مصر و عراق اور شام کاتذکرہ کیاہے۔ مگر اتنامتضاد کہ نہیں معلوم ہوتایہ کس عمراور سن کی بات ہے۔

؎یہ معمہ ہے سمجھنے کانہ سمجھانے کا

سب سے پہلے مولاناآزاد کے سفرِ مصر کاذکر1940ء میں گاندھی کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مہادیوڈیسائی نے مولاناآزادپر انگریزی میں لکھی گئی سوانح میں کیا۔ جس کاکتاب ترجمہ مسٹر آصف عمل نے کیا۔ یہ کتاب مولاناآزاد سے کیے گئے سوالات کے مولانا آزاد کی طرف سے دیے گئے جوابات اور مولانا کی کتاب ''تذکرہ'' سے حاصل کی گئی معلومات سے تیار کی گئی تھی۔ مسٹر ڈیسائی نے لکھا۔

''وہ (یعنی مولاناآزاد کے والد) یہ چاہتے تھے کہ میں (یعنی مولاناآزاد) کسی نہ کسی طرح فاضل ترین علماء کی جماعت میں اپنانام پیدا کروں۔ لہٰذا انہوں نے مجھے 1905ء میں اپنے ذاتی مصارف سے مصر بھیجاتاکہ قاہرہ کی مشہور یونیورسٹی الازہر میں عربی تعلیم حاصل کر سکوں۔ وہاں دوسال مقیم رہااور 1907ء میں ہندوستان واپس آیا۔''

یہ کتاب چھپنے کے بعد سوال پوچھا جانے لگا کہ آیا مولاناآزاد نے واقعی الازہر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر کہیں سے تردیدی یاتوضیحی بیان نہ آیا۔ حالانکہ 1903ءاور1904ء میں مولاناکلکتہ میں ''لسان الصدق'' کے ایڈیٹر تھے، 1905اور 1906 میں ''الندوہ''

کے پھر 1908تک ''الوکیل'' کے ایڈیٹر رہے تھے۔ درمیان میں ''دارالسلطنت'' اور پھر واپس ''الوکیل'' امرتسر میں۔ جب باتیں زبانوں سے تحریر میں آئیں تو پھر 17فروری1949ء کو ''نیا ہندوستان'' میں مولانا آزاد کے حاشیہ نشین شاہد شیروانی نے ایک مضمون ''امام الہند'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ جس میں انہوں نے لکھا۔

''یہ غلط ہے کہ مولانا نے جامعہ الازہر قاہرہ میں تعلیم پائی ہے۔ مسٹر آصف علی کی طرح دوسرے سوانح نگاروں مہادیو ڈیسائی وغیرہ نے بھی دھوکا کھایا ہے۔ 1907 میں مصر وغیرہ گئے تھے۔ ظاہر ہے اس وقت 18 سال کی عمر تھی اور ہندوستان کی صحافتی اور علمی دنیا میں اپنے معرکتہ لآرا مضامین کی بدولت کافی شہرت و وقعت حاصل کر چکے تھے۔ تکمیلِ تعلیم 16-15 کی عمر ہی میں ہو چکی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا نے علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی طرح اکابر جامعہ ازہر اور مفتی محمد عبدہ' کے دارالعلوم کے شیوخ سے استفادہ کیا اور ان کی علمی مجالس کی زینت بنے،اس کی تحقیق24 جنوری1947ء کی ایک ملاقات میں خود امام الہند سے کر چکا ہوں۔اس سفر میں برادرِ گرامی غلام یٰسینِ آہ مرحوم بھی امام الہند کے ساتھ تھے۔ مگر وہ عراق سے واپس آ گئے۔اور مولانا1907ء میں ایک سال کی سیر وسیاحت کے بعد واپس ہوئے۔''

مولانا آزاد سے بذاتِ خود پوچھنے کے بعد شاہد شیروانی نے اس بات کی تو تردید کر دی کہ آیا مولانا نے الازہر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ190ء میں اپنے بھائی کے ساتھ مصر اور پھر عراق گئے تھے۔ وہاں ان کے بھائی بیمار ہو گئے تھے وہ راستے

سے واپس لوٹ آئے تھے۔ اسی طرح خود مولانا آزاد نے بھی ''آزادی ہند'' میں الازہر سے تعلیم حاصل کرنے کی یوں تردید کی۔

''اس موقع پر میں ایک غلطی کو درست کرنا چاہوں گا جسے مہادیو ڈیسائی نے عام کیا تھا۔ انہوں نے جب میری سوانح عمری لکھی تو بہت سے سوال ترتیب دیے اور مجھ سے ان کے جواب کی فرمائش کی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جب میری عمر بیس برس کے قریب تھی۔ میں نے مشرقِ وسطیٰ کا ایک دورہ کیا اور خاصا وقت مصر میں گزارا۔ ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا تھا کہ روایتی تعلیم صرف ہندوستان ہی میں غیر تشفی بخش اور غیر موثر نہیں تھی بلکہ قاہرہ کی مشہور جامعہ الازہر کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ مہادیو ڈیوسائی نے ان جوابات سے کسی طرح یہ نتیجہ نکال لیا کہ میں مصر الازہر میں پڑھائی کی غرض سے گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں وہاں ایک روز کے لیے بھی طالبِ علم نہیں رہا۔ شاید یہ غلطی ان کے اس گمان سے پیدا ہوئی کہ اگر کسی شخص نے کچھ علم حاصل کیا ہے تو لازماً کسی یونیورسٹی میں کیا ہو گا۔ مہادیو ڈیسائی کو جب پتہ چلا کہ میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی کا طالبِ علم نہیں رہا تو انہوں نے یہ سمجھ لیا میں نے الازہر سے ضرور سند حاصل کی ہو گی۔'' اس بیان سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ مولانا آزاد نے ازہر سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ہاں وہ مصر اور عراق گئے تھے۔ اسی طرح ''غبارِ خاطر'' کے ''خط 16'' میں ان کے لبنان و ایران میں گزارے دنوں کا تذکرہ بھی ہے۔ مگر سال کا ذکر نہیں۔

مولانا آزاد کی اپنی زندگی میں ہی، مولانا کے قریبی ساتھی مولانا سید سلیمان ندوی جو ''الندوہ'' میں ان کے ساتھ رہے تھے اور کچھ عرصہ الہلال میں بھی رہے، اشاروں کنایوں میں کہہ چکے تھے کہ مولانا ہندوستان سے باہر نہیں گئے۔ پھر ماہنامہ ''برہان'' میں مولوی میر محمد خاں صاحب، شہاب مالیر کوٹلوی نے مولانا آزاد کے سفرِ مصر و ایران کو غلط قرار دیا۔ اس کے بعد 1951ء میں مولانا رئیس احمد جعفری نے اپنا مضمون مولانا ماہر القادری کو ''فاران'' میں چھپنے کے لیے بھیجا۔ جس میں بقول ماہر القادری دو ٹوک الفاظ میں مولانا آزاد کے سفرِ عراق و ایران کو افسانہ ثابت کیا گیا تھا۔ یہ مضمون مولانا ماہر القادری نے شائع تو نہ کیا مگر تحقیقِ حال کے لیے 31 اگست 1951ء کو مولانا آزاد کو ایک خط لکھا جس میں چند سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی پوچھا تھا کہ مصر، عراق، ایران اور شام کے سفر آپ نے کس سن میں فرمائے تھے۔ اور شیوخ الازہر سے کس زمانے میں ملاقاتیں کی تھیں۔ مگر مولانا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر رجسٹرڈ خط یاد دہانی کے لیے 18 ستمبر 1951ء کو لکھا مگر مولانا نے اس کا بھی جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔

بڑے آدمیوں کے مرنے کے بعد ان کے وطن، سن پیدائش، تصانیف اور دوسرے حالات کے بارے میں تحقیق ہوتی رہتی ہے۔ اور طرح طرح کی بحثیں چلتی رہتی ہیں۔ ایک مصنف، ادیب، مفسر، عالم اور سیاسی رہنما کی زندگی میں ہی اس کے حالات پر بحث چھڑ جائے تو عظیم شخصیت پر اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے بارے صحیح معلومات

دے کر بات کو صاف کر دے اور ان بحثوں کو مشتبہ اور مبہم نہ رہنے دے۔ مگر نہ جانے کیوں مولانا آزاد نے اپنے بیرونِ ہندوستان سفر کو کچھ زیادہ ہی مبہم رہنے دیا۔

"آزاد کی کہانی" میں بھی سفرِ عراق کا تذکرہ موجود ہے۔۔اس کتاب میں مولانا آزاد اپنے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

"انہیں بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں جب ایک ساتھی یعنی عبدالرحمان امر تسری مل گئے تو انہوں نے عراق کا ارادہ کیا۔ عراق ہم دونوں ساتھ گئے۔ لیکن میں وہاں پہنچ کر سخت بیمار ہو گیا اور واپس چلا آیا اور وہ حافظہ صاحب کے ہمراہ موصل دیارِ بکر شام کی طرف گئے۔ وہیں بیمار ہو گئے۔ انگریزی قونصل کے ذریعہ بغداد پہنچائے گئے۔ اتفاق سے مسٹر سجاد حیدر اس وقت بغداد میں قونصل خانے میں اسٹنٹی پر موجود تھے۔ انہوں نے ہمدردری کی اور بمبئی میں والد کو مطلع کر دیا۔ بہر حال برٹش قونصل کے ذریعے سے روپیہ بھیجا گیا اور وہ بمبئی آئے۔ حد درجہ نحیف تھے۔ بالآخر چند ماہ بعد 1907ء میں راہ گزارِ عدم ہوئے۔" اب قارئین ذرا غور کریں۔ شاہد شیر وانی کا بھی کہنا ہے کہ مولانا آزاد اپنے بھائی کے ساتھ عراق و شام گئے تھے اور "آزاد کی کہانی" بھی یہی کہتی ہے کہ دونوں بھائی اکٹھے گئے تھے۔ مگر شاہد شیر وانی کے مولانا آزاد سے پوچھے ہوئے بیان کے مطابق مولانا کے بڑے بھائی عراق میں بیمار ہو گئے تھے اور وہ واپس آ گئے تھے جبکہ مولانا آزاد ایک سال کی سیاحت کے بعد واپس لوٹے۔ مگر "آزاد کی کہانی" بتاتی ہے کہ مولانا پہلے خود بیمار ہو کر عراق سے واپس لوٹ آئے تھے اور ان کے بھائی شام چلے گئے

تھے۔ وہیں بیمار ہوئے اور پھر واپس لائے گئے۔ دونوں بیانوں میں کھلا تضاد ہے۔ اسی طرح ''آزاد کی کہانی'' میں اگرچہ مولانا کے بھائی کے انتقال کا سال 1907ء لکھا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا انتقال 1906ء میں ہوا تھا جس کا ثبوت وصل بلگرامی کا وہ تعزیتی مضمون ہے جو انہوں نے رسالہ ''عالمگیر'' میں اکتوبر 1906ء میں لکھا۔ وہ لکھتے ہیں

''مولوی ابو النصر غلام یٰسین آہ دہلوی مرحوم نہایت لائق مضمون نویس اور عمدہ شاعر تھے۔ آپ کا کلام خدنگ نظر اور دیگر علمی رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ حال ہی میں آپ اسلامی ممالک کی سیر کو گئے تھے۔ وہاں سے آتے ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔''

اس مضمون سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ مولانا آزاد کے بھائی اسلامی ممالک کی سیر کو گئے تھے اور دوسرا یہ کہ یہ سفر 1905ء اور 1906ء میں ہی ہوا تھا۔ اگر مولانا آزاد ساتھ تھے تو وصل بلگرامی یہ ضرور لکھتے کہ وہ بھی بھائی کے ساتھ تھے۔ چونکہ وصل بلگرامی غلام یٰسین آہ سے ذاتی مراسم رکھتے تھے۔ پھر مولانا آزاد 06-1905 میں جا بھی کیسے سکتے ہیں کیونکہ یہ بات پہلے بتائی جاچکی کہ 06-1905ء میں وہ ''الندوہ'' لکھنو کے ایڈیٹر تھے۔ وہاں سے ان کے مضمون چھپ رہے تھے۔ لہٰذا ان سالوں میں ان کا کسی غیر ملک کا سفر ناممکن ہے۔ 1902 سے 1905ء میں مولانا آزاد ''لسان الصدق'' نکال رہے تھے۔ 1906ء سے 1908ء تک وہ ''الوکیل'' اور دارالسلطنت کے ایڈیٹر تھے۔ یہ تو ایک معمہ ہے۔ اگر مولانا آزاد کا کوئی مرید اسے حل کر سکے تو اور بات ہے۔ ورنہ مولانا رئیس

احمد جعفری اور مولانا ماہر القادری کا مولانا آزاد کے سفرِ ایران و عراق کو افسانہ کہنا کسی طرح بھی غلط نہیں لگتا۔

بیرونِ ہندوستان مولانا ابوالکلام آزاد کے سفر کا تذکرہ "آزادی ہند" میں بھی ملتا ہے۔ 1905ء میں بنگال کی تقسیم اور وہاں کے انقلابی ورکروں سے اپنے میل جول کے واقعات کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔ "یہی وہ زمانہ تھا جب مجھے ہندوستان سے باہر جانے اور عراق، مصر، شام اور ترکی کا ایک دورہ کرنے کا موقع ملا۔ 1908ء میں جب میں نے قاہرہ کا سفر کیا، اس وقت الازہر کا انتظام اتنا ناقص تھا کہ اس سے نہ تو دینی تربیت ملتی تھی اور نہ قدیم اسلامی علوم اور فلسفے کا کچھ علم حاصل ہو سکتا تھا۔ مصر سے میں ترکی اور فرانس گیا اور وہاں میرا ارادہ لندن جانے کا تھا۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکا کیونکہ مجھے یہ خبر ملی کہ میرے والد بیمار ہیں۔ میں پیرس سے واپس آگیا اور بعد کے بہت برسوں تک لندن نہیں دیکھ سکا۔"

پہلے ہی مولانا آزاد کے بیرونِ ہندوستان سفر کے متعلق سوالات تھوڑے تھے کہ مولانا کے آخری زندگی کے اس بیان نے ان میں مزید اضافہ کر دیا۔ پہلے ایران، عراق، مصر اور شام کے سفر کے تذکرے تھے اور اب ترکی اور فرانس بھی شامل ہو گئے۔ مولانا آزاد کے والد کا انتقال اگست 1908 میں ہوا تھا۔ لہٰذا مولانا کا مذکورہ بالا سفر اس سے پہلے ہی ہونا چاہئے کیونکہ مولانا فرماتے ہیں وہیں مجھے اپنے والد کی بیماری کی اطلاع ملی مگر ہم پہلے ہی بتا چکے 1907ء اور 1908ء میں مولانا آزاد اخبار "الوکیل" امرتسر کے ایڈیٹر تھے۔ یہ تو

ہو نہیں سکتا کہ ہندوستان میں کسی اخبار کے ایڈیٹر بھی ہوں اور ادھر کئی ممالک کی سیر و سیاحت بھی فرمارہے ہوں۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مولانا کی صحافتی مصروفیات کا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔ مولانا آزاد نے 1899ء میں ''نیر نگِ عالم'' اور 1901ء میں ''المصباح'' کا اجراء کیا۔ پھر نومبر 1903ء میں ''لسان الصدق'' جاری کیا جس کا آخری شمارہ 1905ء میں شائع ہوا۔ ''لسان الصدق'' کا عکسی ایڈیشن شائع ہو چکا ہے جس سے تاریخوں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے انہیں لکھنؤ بلا لیا جہاں وہ اکتوبر 1905 سے اپریل 1906ء تک ''الندوہ'' کے ایڈیٹر رہے۔ جس میں چھپنے والے مضامین تاریخوار کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہاں سے وہ امرتسر آگئے اور اخبار ''الوکیل'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ یہ جون جولائی 1906ء کی بات ہے کچھ عرصہ والد کے بلانے پر کلکتہ چلے گئے جہاں وہ اخبار ''دارالسلطنت'' کی ادارت کرتے رہے۔ والد سے اجازت لے کر اگست 1907ء میں دوبارہ امرتسر آگئے اور ''الوکیل'' کی ادارت سنبھال لی۔ اور اگست 1908ء تک ''الوکیل'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

ایک طرف مولانا آزاد کی ان مصروفیات کو ذہن میں رکھئے اور دوسری طرف ان کے بیرونِ ہندوستان کے انتہائی متضاد بیانات کو پڑھئے۔ 1899 سے لے کر اگست 1908 تک کے درمیان چند ماہ بھی ایسے نہیں ملتے جب وہ کسی رسالے یا اخبار سے منسلک

نہ ہوں۔ مگر دعویٰ ہے سیر وسیاحت کا۔ پھر اگر کسی نے ان اسفار کو ہوائی باتیں کہا ہے تو بجا ہی لگتا ہے۔ آخر میں ایک اور حوالے کا ذکر بھی ضروری ہے تاکہ اس سلسلے میں مزید کسی سوال کی گنجائش نہ رہے۔ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد مولانا آزاد کے سیکرٹری ہمایوں کبیر نے انگریزی میں مولانا پر ایک کتاب مرتب کی تھی جس میں مشہور فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینوں کے ایک مضمون کا حوالہ تھا۔

''ان (مولانا آزاد) سے میری ملاقات پچاس سال پہلے 1908-1907 میں بغداد میں ہوئی تھی۔ ہم مسجد مرجان میں ملے تھے۔ ہم دونوں اپنے محترم استاد الحاج علی آلوسی کے شاگرد تھے۔ جن کا مرقد اسی مسجد میں ہے۔'' یہ حوالہ معلوم نہیں کہاں سے ہاتھ لگا یا لگایا گیا اور مولانا کے مریدین اچھل پڑے کہ دیکھئے۔ مولانا آزاد کے جس سفرِ عراق کو افسانہ کہا جارہا تھا اس کا ثبوت مل گیا اور ناقدین کو اپنی زبانیں بند کردینی چاہئیں۔

مگر کہاں جناب! پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔ ایک تو مولانا آزاد نے کبھی نہیں کہا کہ وہ باہر کے کسی عالم کے شاگرد بھی رہے۔ اور اس کی تردید (یعنی باہر کسی ملک میں تعلیم) وہ مہا دیوڈیسائی کی غلط فہمی دور کرنے کے ضمن میں فرما چکے۔ دوسرا پھر اس حوالے میں سن 1907 اور 1908ء کا ذکر ہے جبکہ ہم بتا چکے اس وقت مولانا آزاد ''الوکیل'' امر تسر کے ایڈیٹر تھے۔

اور آخری بات یہ کہ لوئی ماسینوں کا جو حوالہ دیا گیا اس کی تردید خود لوئی ماسینوں نے کر دی تھی۔ 1968ء میں ابو سلمان شاہجہاں پوری نے مولانا کے خطوط کا ایک مجموعہ ''مکاتیب ابو الکلام آزاد'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ جس پر مولانا ماہر القادری نے اپنے رسالے ''فاران'' میں تبصرہ کیا تھا اور اسی میں لوئی ماسینوں کے مولانا آزاد سے متعلق اوپر دیئے گئے مضمون کا حوالہ بھی آیا تھا۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری نے مجموعے کے دیباچے میں لکھا تھا کہ ''دنوں تک یہ بات موضوعِ گفتگو بنی رہی کہ آیا یہ واقعہ ہے یا محض افسانہ سرائی (یعنی سفرِ عراق) یہ غلط فہمی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نوراللہ مرقدہ کے بعض جملوں سے پیدا ہوئی۔ فرانسیسی مستشرق کی اس شہادت نے تمام شبہات کو دور کر دیا ہے۔ اب اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔'' یہ شمارہ پڑھنے کے بعد فرانس سے نامور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے ایک مکتوب مولانا ماہر القادری کے نام بھیجا تھا۔ جس میں انہوں نے فرمایا۔

''دسمبر کے ''فاران'' میں ''مکاتیبِ ابو الکلام آزاد'' اور ابو سلمان شاہجہان پوری پر تنقید چھپی ہے۔ صفحہ 59-58 پر مولانا ابو الکلام کے سفرِ عراق پر لوئی ماسینوں کے بیان سے استدلال کا ذکر ہے۔ لوئی ماسینوں اب انجہانی ہو چکے ہیں۔ آٹھ دس سال کی بات ہے۔ ایک دن وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آیا ابو الکلام کبھی بغداد گئے تھے میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو پریشانی کے انداز میں کہنے لگے کہ کوئی صاحب مجھ سے دریافت کر رہے ہیں اور ایک بیان سے استدلال کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مجھے کچھ علم نہیں۔ ممکن ہے یہ ابو سلمان صاحب ہی کے

خط کا معاملہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو مناسب ہے کہ وہ لوئی ماسینوں کے تازہ تر بیان کو بھی شائع کریں۔ محض کسی پرانے بیان پر اکتفانہ کریں۔ ابو الکلام عراق گئے تھے تو، نہ گئے تھے تو، ان کی عظمت میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔''

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا فرمانا تو خوب ہے کہ سفرِ عراق کے اثبات و نفی سے مولانا آزاد کی عظمت میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔ پر اگر یہ سفر ہوا ہی نہیں اور یہ محض افسانہ آرائی ہے تو پھر یقینا''فرق پڑتا ہے۔

دوسروں کی تحریریں جو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ہوئیں

بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں جاری ہونے والے جرائد و رسائل کے متعلق جاننے والوں کے علم میں ہے کہ اگرچہ عملہ ادارت میں کافی لوگ ہوتے تھے اور وہ اپنی تحریریں بھی لکھ کر چھپواتے تھے۔ مگر ہر مضمون کے ساتھ صاحبِ تحریر کا نام لکھا جانا ضروری نہ تھا۔ صرف ٹائٹل پر ایڈیٹر کا نام ہوتا تھا۔ ایسا کچھ بہت سے رسائل میں موجود ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ تمام رسائل اسی طرح چھپتے تھے۔ کئی رسائل ایسے بھی تھے جن میں تحریر کے ساتھ مصنف کا نام بھی لکھا ہوتا تھا۔

ایسے رسائل جن میں مضامین کے ساتھ مصنف کا نام نہیں ہوتا تھا۔ ان رسائل کے مضامین جب بعد میں مرتب کیے جاتے تھے تو مرتبین کی طرف سے تمام مضامین ایڈیٹر کے نام لگا دیے جاتے تھے۔ ایسا ہی معاملہ مولانا آزاد کے سلسلے میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ خاص کر ''الہلال'' پر صرف ایڈیٹر کے طور مولانا ابوالکلام آزاد کا نام چھپتا تھا اور مضامین کے ساتھ فرداً فرداً مصنف کا نام نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ بہت سے دوسرے لوگ مولانا کے ساتھ حلقۂ ادارت میں شامل تھے اور وہ رسالے کے لیے لکھتے بھی تھے۔ مگر بعد میں جب بعض مرتبین نے مضامین کے مجموعے چھاپے تو ''الہلال'' کے تمام مضامین مولانا آزاد کے نام کر دیے۔ ویسے یہ ذمہ داری تو خود مولانا آزاد کی بنتی تھی کہ وہ بتلاتے فلاں مضمون میرا ہے اور فلاں تحریر فلاں صاحب کی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ اس کے بارے میں سید حسن مثنیٰ ندوی کی تحقیق جو

انہوں نے اپنے رسالے ''مہرِ نیمروز'' میں کئی صفحوں میں پیش کی، یہ ہے کہ یہ تفسیر دراصل علامہ رشید رضا مصری کی عربی تفسیر ''المنار'' کا ترجمہ، تلخیص، چربہ اور سرقہ ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے سید سلیمان ندوی کے ایک خط کا حوالہ پیش کرنا مناسب ہے۔ یہ خط انہوں نے 28 جون 1952ء (یعنی مولانا آزاد کی زندگی میں) شاہ فضل امام کے نام لکھا اور جو یکم ستمبر 1965ء کو ''ہماری زبان'' میں شائع ہوا۔ سید صاحب لکھتے ہیں۔

''اس عہد کے نوجوانوں کو شاید یہ معلوم نہ ہو گا کہ ابو الکلام اور مولانا شبلی اور ان کے متعلقین کے درمیان محبت اور تعاون کے کیسے تعلقات تھے جو ہمیشہ قائم رہے۔ نواب صدر یار جنگ سے بھی موصوف کو جو تعلق اور شناسائی حاصل ہوئی وہ بھی اسی آستانہ کا فیض تھا۔ اب جو شخص اپنے طرزِ عمل سے اس سے اعراض برتتا ہے وہ حقیقت میں احسان فراموش ہے۔ زندوں کی مدح سے مرِدوں کا مرثیہ زیادہ مشکل ہے کیونکہ مردہ سے کسی صلہ کی امید نہیں ہو سکتی۔

'' بہر حال مولانا ابوالکلام آزاد نے جب الہلال نکالا تو ایک ہی دو اشاعتوں کے بعد ان کو اپنے لیے مددگار کی ضرورت پیش آئی۔ مولانا شبلی کو انہوں نے لکھا، مولانا نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے ایک تازہ ندوی خواجہ عبدالحمید صاحب ندوی کا نام پیش کیا۔ جو انگریزی بھی جانتے تھے۔ چنانچہ وہ بھیجے گئے اور شروع سے آخر تک وہ ''الہلال'' میں رہے۔

انگریزی و عربی تراجم سب ''الہلال'' میں انہیں کے قلم سے ہیں۔ خواجہ صاحب اب بھی موجود ہیں اور اب وہ ایم اے ہیں اور کانپور میں مشن کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہیں۔ وہ سب حقیقتِ حال سے واقف ہیں۔

''اس زمانے میں ''الہلال'' ایک سیاسی بین الاسلامی تحریک سمجھی جاتی تھی۔ اور مجھے حضرت الاستاد کی تربیت و محبت میں اس سے دلچسپی تھی۔ اس لیے مولانا ابوالکلام کے کہنے سے میں مولانا شبلی صاحب کے پاس سے مولانا ابوالکلام کے پاس ''الہلال'' چلا آیا۔ اس کا ذکر آپ کو مکاتیبِ شبلی میں ملے گا۔

''بہر حال چار پانچ ماہ ان کے ساتھ رہا، میرے ہی ساتھ میرے دوست اور استاذ اور البیان اور وکیل کے سابق ایڈیٹر مولانا عبد اللہ عمادی بھی ''الہلال'' میں آگئے۔ وہ بھی چند ماہ رہے۔ ہم لوگ کوشش کرتے تھے کہ تحریر میں ابوالکلام صاحب کے طرزِ تحریر کا اتباع کریں۔ اس لیے ''الہلال'' میں جو کچھ لکھا جاتا تھا اس رنگ میں لکھا جاتا تھا۔ میرے اور عمادی صاحب کے چلے جانے کے بعد مولانا عبد السلام ندوی ''الہلال'' میں آگئے اور آخر دم تک رہے۔

''اب ظاہر ہے کہ ہم لوگ جو وہاں شریکِ تحریر و ادارت تھے کچھ نہ کچھ ہر ہفتہ لکھا ہی کرتے تھے اور جو لکھا جاتا تھا وہ چھپتا بھی ہو گا۔ ورنہ بغیر کام لیے کون ہمیں تنخواہ دے سکتا تھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہماری تحریروں میں ایڈیٹر صاحب کچھ اضافہ اور کچھ کمی کرتے

تھے۔اور اس لیے ایسی تحریروں کو نہ ہم اپنی پوری کہہ سکتے ہیں اور نہ ایڈیٹر صاحب اپنی کہہ سکتے ہیں۔

''اس درمیان میں مسجد کانپور کے واقعہ کے زمانے میں ایڈیٹر صاحب کسی مصلحت سے مہینے دو مہینے کے لیے مسوری تشریف لے گئے۔ان کی غیر حاضری میں میری اور عمادی صاحب کی تحریریں ان کے تصرف کے بغیر شائع ہوئیں۔ان تحریروں میں ''مشہدِ اکبر''، ''تذکار نزولِ قرآن''، ''قصص بنی اسرائیل'' وغیرہ مضامین میرے ہیں۔اب اس وقت نہ الہلال سامنے ہے اور نہ مجموعہ مضامین ابوالکلام۔ مگر جہاں تک یاد آتا ہے حریت کے سلسلے میں ''اسلام کے سیاسی نظام'' کا مضمون میں نے لکھا تھا جو اس سے پہلے ''الندوہ'' میں ''اسلام اور اشتراکیت'' کے عنوان سے چھپ چکا تھا۔اس کو دوبارہ الہلال کے رنگ میں لکھا۔ مولانا نے اس میں انقلابِ فرانس وغیرہ مسائل کا اضافہ فرمایا ہے۔

''اسی طرح دوسرا مضمون ''تاریخِ حبشہ کے گم شدہ اوراق'' میرا مضمون ہے جو مقریزی کے رسالے کی تلخیص ہے۔ اس میں بھی مولانا نے کچھ تصرف کر کے شائع کیا۔ اس طرح ''کشفِ ساق''، ''اسوۂ نوحی اور اسوۂ ابراہیمی'' وغیرہ مضامین عمادی صاحب کے ہیں۔ ''العرب فی القرآن یا فی الاسلام'' کا مضمون عبد السلام ندوی کا ہے۔ ''انسانیت موت کے دروازے پر'' غالباً عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کا مضمون ہے۔ مگر ناشرین نے ان سب کو ابوالکلام صاحب کے نام سے شائع کیا ہے۔اس میں ابوالکلام صاحب کا قصور

خاموشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی شہرت میں ہمارے قلم کے محتاج نہیں ہیں اور ہم لوگ بھی ان کے محتاج نہیں مگر یہ ایک واقعہ ہے۔"

سید سلیمان ندوی صاحب نے خیالِ خاطرِ احباب سے کام لیا ہے ورنہ قصور یہی خاموشی ہی تو ہے۔ اور خاموشی نیم رضامندی کہلاتی ہے۔ پھر ناشرین کا تو کوئی قصور نہ ہوا۔ تمام ذمہ داری مولانا آزاد ہی کی بنتی تھی کہ بات صاف کر دیتے مگر بات واضح کرنے کی بجائے وہ الجھانے اور مشکوک کرنے کے عادی تھی۔ جس کی مزید تفصیل درج ذیل واقعہ سے بھی ہو جاتی ہے۔

مولانا حیدر زمان صدیقی صاحب کی کتاب "اسلامی نظریۂ سیاست" مکتبہ دین ودانش بانکی پور پٹنہ سے 1947ء میں شائع ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا دیباچہ لکھا۔ دیباچہ کے حاشیہ پر ایک جگہ انہوں نے لکھا۔ ""الہلال" میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لیے "الہلال" کے مضمونوں کے مجموعے شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی طرف منسوب کر دیا حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ "حریۃ فی الاسلام" "تزکارِ نزولِ قرآن"، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر (اولی) وغیرہ میرے مضامین ہیں۔"

اس حوالے سے دلچسپ صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب سہ روز مدینہ بجنور کے ایڈیٹر نے مولانا آزاد سے ملاقات میں یہ معاملہ پوچھ ہی لیا۔ جس کا تذکرہ انہوں نے 17 اگست 1951ء میں اپنے رسالے میں اس طرح کیا۔

''میں نے اس بات کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد سے کیا تو فرمایا...... ہاں! سید سلیمان ندوی صاحب نے میرے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے چھ مہینے تک کام کیا ہے۔ وہ ترجمے بھی کرتے تھے اور مضامین بھی لکھتے تھے، خیر اگر وہ کسی مضمون کو اپنا بتاتے ہیں تو میری طرف سے آپ ''مدینہ'' میں اعلان کر دیجئے کہ وہ مضمون سید صاحب کا ہے۔ کچھ مضامین اگر میرے نام نہ ہوئے تو میرے بھائی! اس میں میرا کیا بگڑتا ہے؟ آخری جملہ کہہ کر مولانا آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں جس کی گونج اظہارِ بے نیازی کے موقع پر سنائی دیتی ہے۔ ایک قہقہہ لگایا اور پھر سگریٹ کا کش لیا۔''

مولانا آزاد کا یہ جواب گول مول سا ہے۔ شانِ بے نیازی کا اظہار بھی اور ''نفی و اثبات' کے دونوں رخوں کی جھلک بھی۔ حالانکہ یہ بات سگریٹ کے کش اور قہقہے میں اڑا دینے کی نہ تھی۔ واضح طور سے کہنا چاہیے تھا کہ یہ مضامین سید صاحب کے ہیں۔ پبلشروں نے غلطی سے میرے نام منسوب کیے۔ جبکہ انہوں نے صاف جواب نہیں دیا۔ جبکہ دوسری طرف ایک اور معاملے میں انہوں نے دوٹوک جواب دینا ضروری سمجھا تھا۔ 1955ء میں مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب ''یارانِ کہن'' شائع ہوئی جو مشاہیر کے خاکوں پر مشتمل تھی۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ذکر کے ضمن میں ایک جگہ انہوں نے لکھا۔

''بہر حال مولاناابوالکلام آزاد مرزاصاحب (قادیانی) کے دعوائے مسیحتِ موعود سے تو کوئی سروکار نہ رکھتے تھے لیکن ان کی غیرتِ اسلامی اور حمیتِ دینی کے قدردان ضرور تھے۔ یہی وجہ ہے جن دنوں مولاناامرتسر کے اخبار ''وکیل'' کی ادارت پر مامور تھے اور مرزاکاانتقال انہی دنوں ہواتو مولانانے مرزاکی خدماتِ اسلامی پر ایک شاندار شذرہ لکھا۔ ''

یہ کتاب چونکہ شورش کاشمیری نے چھاپی تھی۔ اس لیے مولاناآزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری خان محمداجمل خاں نے شورش کے نام مکتوب لکھاجس میں کہا۔

''عبدالمجید سالک نے ایک کتاب ''یارانِ کہن'' لکھی ہے جس میں بعض باتیں بے بنیاد مولاناآزاد سے متعلق درج ہیں۔ ''الوکیل'' میں مرزاقادیانی کی وفات پر جوخاکہ اختتامیہ چھپاتھاوہ منشی عبدالمجید کپورتھلوی کالکھاہواتھا۔ مولاناکااس اداریہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔''

یہاں معاملہ چونکہ بہت حساس تھااس لیے دوٹوک الفاظ میں بتادیاگیاکہ شذرہ مولاناکا نہیں مگر سید سلیمان ندوی کے سلسلے میں دوٹوک جواب نہیں دیاگیا۔اب اسے کیاکہیں۔ پھر یہ تو سید صاحب نے اظہار کردیاجبکہ کئی اور لوگ بھی معاون رہے تھے مولاناکے، انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیایاان کااظہار سید صاحب کی طرح منظرِعام پر نہیں آیا۔ معلوم نہیں ایسے کون کون سے مضامین ہیں جو دوسروں نے لکھے مگر وہ مضامین آج تک مولانا آزاد کے نام سے چھپ رہے ہیں۔

اب میں اپنے مضمون کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں۔ جس میں میں نے بتلایا تھا کہ مولانا آزاد کی ''ترجمان القرآن'' دراصل علامہ رشید رضا کی شیخ محمد عبدہ کے تفسیری لیکچروں پر مشتمل تفسیر ''المنار'' کا ترجمہ، تلخیص اور سرقہ ہے۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ 1965-66 میں کراچی سے ماہنامہ ''مہرِ نیم روز'' علی اکبر، سید حسن مثنیٰ ندوی اور ابوالخیر کشفی کی مجلس ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اس میں ادبی سراغ رساں کا ''چہ دلاور است'' کے نام سے سلسلہ مضامین چلتا رہا۔ جس میں مشرق و مغرب میں سرقہ اور سرقہ شدہ کتابوں پر تبصرے ہوتے تھے۔ ساتھ ہی اصل کتاب اور سرقہ شدہ کتاب کا عبارتوں کے موازنے کے ذریعے تجزیہ پیش کیا جاتا تھا۔ اسی سلسلہِ مضامین میں حسن مثنیٰ ندوی نے 50 صفحات پر مشتمل تجزیہ لکھا جس میں ''ترجمان القرآن'' اور ''تفسیر المنار'' کی عبارتوں کو آمنے سامنے رکھ کر ثابت کیا کہ مولانا آزاد کی کتاب ''تفسیر المنار'' سے سرقہ شدہ ہے۔

انہوں نے لکھا۔ ''مفتی محمد عبدہ نے سید رشید رضا کے اصرار پر تفسیری لیکچر کا سلسلہ 1897 سے جامعہ ازہر میں شروع کیا تھا جو 1905ء تک جاری رہا۔ رشید رضا کے پاس سارا ذخیرہ جمع تھا اور شیخ کی زندگی ہی میں اپنے رسالے ''المنار'' میں شائع کرتے رہے۔ مولانا آزاد کا اپنا بیان ہے وہ 14 سال کی عمر سے المنار پڑھ رہے تھے۔ 1903 میں مقدمہ تفسیر، تفسیر پارہ عم اور تفسیر سورہ والعصر چھپ چکیں تھیں۔ مولانا آزاد نے 1930ء کو اپنی تفسیر مکمل کی اور اس کی پہلی جلد 1931ء میں شائع ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کو ''تفسیر المنار'' کے مباحث و نکات اپنی کتاب میں جا بجا بکھیرنے پڑے اور پھیلانے

پڑے، کہیں کم کرناپڑاتوکہیں کچھ زیادہ کرناپڑا۔ جواوپر تھااس کو نیچے لاناپڑا، جو نیچے تھااس کواوپر لے جاناپڑا یاکسی اور مقام پر درج کرناپڑااور بہت سی عبارتیں بھی بدلنی پڑیں۔''

اور ہاں مولاناآزاد نے علامہ رشید رضاکے افکار و خیالات کو کس طرح گھول کے پیاہوا تھا اس کاایک حیرت انگیز واقعہ مولاناکے خلیفہ مجاز عبدالرزاق ملیح آبادی نے ''ذکرِ آزاد'' میں یوں بیان کیاہے۔

''1912ء میں ندوہ کا سالانہ اجلاس لکھنؤمیں تھا۔ علامہ رشید رضا یہاں آئے ہوئے تھے۔ان کی عربی تقریر کے ترجمے کی ذمہ داری مولاناآزاد کے ذمہ تھی۔جب علامہ رضا نے تقریر شروع کی تو مولاناچند منٹ بعد غائب ہوگئے۔ تقریر تقریباً 2 گھنٹے جاری رہی۔ علامہ شبلی اور منتظمین بدحواس تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو مولاناآزاد سٹیج پر آگئے۔ پھر مولانا نے ترجمے کے طور پر تقریر کی جو اصل عربی سے سوا تھی۔سب کو حیرت ہوئی۔جب میں نے پوچھابغیر سنے آپ نے ترجمہ کیسے کیا۔ تو فرمایاابتدائیہ سن کر مجھے معلوم ہو گیا تھاکہ کیا کہیں گے۔''

جب مولاناآزاد علامہ رشید رضاکی 2 گھنٹے کی تقریر بغیر سنے ترجمہ کر سکتے ہیں تو پھر اسی طرح انہوں نے ''تفسیر المنار'' کو بھی بغیر پڑھے ''ترجمان القرآن'' کی صورت میں ڈھال لیاہو۔اس میں حیرت نہیں ہونی چاہیئے۔مولاناکی پیش گوئیوں کاپہلے ہی شہرہ ہے۔

اب یہ نئی بات بھی سامنے آئی کہ وہ کسی کے دماغ میں موجود خیالات کو بھی پڑھ کر بیان کر سکتے تھے۔

بات مولانا آزاد کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کی چلی ہے تو یہاں مناسب ہے کہ اس تفسیر پر مولانا سید محمد یوسف بنوری کی تفصیلی تنقید کے چند اقتباس پیش کر دیے جائیں تا کہ پاک و ہند کے وہ لوگ جو مولانا آزاد کو ''امام الہند'' منوانے پر تلے بیٹھے ہیں وہ انہیں بھی پیشِ نظر رکھیں۔ مولانا بنوری فرماتے ہیں۔

''ترجمان القرآن اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ہے جس پر ابو الکلام احمد دہلوی کے مختصر اور مبسوط فوائد تحریر ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے متعلق اور اس میں موجود مخالف سنت و اجماعِ امت مباحث سے متعلق کچھ وضاحت بیان کر دوں۔ موصوف ابو الکلام کے بعض مزلات وہفوات کی جانب محض رضائے خداوندی کے حصول اور ہندی طلباء و علماء اور عام عوام تک حق و درست اور واضح بات پہنچانے کے لیے اس سے قبل میں اپنے رسالہ ''فقتہ العنبر'' میں بھی ارشارات تحریر کر چکا ہوں۔

''ابو الکلام آزاد دہلوی طبعی طور پر ایک جذباتی شخص تھے جو ملکی و سیاسی معاملات کی خوب اطلاع رکھتے تھے۔ ساتھ ساتھ اردو تحریر و تقریر میں ملکہ رکھتے تھے۔ ان کی بیس سال قبل کی زندگی اب کی زندگی سے قوم کے لیے زیادہ نفع بخش اور فائدہ مند تھی۔ حصولِ وطن کے لیے جدوجہد کی بنا پر میرے دل میں بھی ان کی خاصی قدر و منزلت ہے۔ اس لیے کہ

انہوں نے ہی ان تحریکات کے ابتدائی دور میں کمزور ہمت افراد کو حوصلہ اور ولولہ بخشا اور آزادی کی خاطر جدوجہد پر خوابیدہ عوام و خواص کو اپنے رسالے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے اجراء سے خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔''

''ان تمام خصوصیات کے باوجود موصوف کی طبیعت میں اپنی آراء وافکار کے متعلق اعجابی کیفیت بہر حال پائی جاتی تھی جس کی بنا پر وہ کئی علمائے حقہ بلکہ ان اکابر ملت پر جو ان کی آراء کی مخالفت کیا کرتے تھے خوب تنقید کرتے۔ اس وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ ان میں کسی قدر اپنی خواہش آمیز افکار و نظریات پر گھمنڈ اور خودرائی کی کیفیت ہے بلکہ بعض مواقع میں آپ موصوف کو درست مسلک و مذہب اور ستھرے عقائد وعلوم سے نکلتا ہوا محسوس کریں گے۔''

''ابتدائی طور پر جہاں تک ہماری معلومات تھیں وہ صحیح العقیدہ شخص تھے۔ مختلف رسائل و اخبارات میں شائع شدہ مقالات و مضامین بھی ان کے صحیح العقیدہ ہونے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن فروعی مسائل میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے۔ لیکن اسی عدم تقلید پر بس نہیں بلکہ علمائے احناف خصوصاً امام الائمہ امام ابو حنیفہ پر بھی انہوں نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں خوب ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اکابر امت کے حق میں خوب بد تمیزی کی ہے اور اس بات کی سعی کی ہے کہ ہندوستان میں وہ ایسے امام بن جائیں جن کی امامت پر اتفاق ہو اور مسلمانوں کے دین و دنیا کے امیر بن جائیں اور ان کے ''امام الہند'' ہونے پر علماء کا اتفاق ہو جائے۔ لیکن ہندوستان میں تو بہت سے صحیح علم و دانش اور

تقویٰ و دیانت کے حامل علمائے امت تھے اور جیسا کہ راقم نے عرض کیا کہ دینی معاملات میں گویا وہ بے مہر و بے لگام تھے جب کہ علم و عمل میں اکابر ہند سے کوسوں دور تھے۔

''چنانچہ علمائے دیوبند نے اس موقع پر بھی جرأت و استقلال کے ساتھ حق کو بے باکی سے بیان کیا اور اعلان کر دیا کہ موصوف اس امامت کے جس کے وہ دعویدار ہیں ہر گز حقدار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ علمائے دیوبند نے اپنی فراستِ صحیحہ سے قبل از وقت ہی ان مفاسد کو پرکھ لیا تھا جو ان کی امامت کو تسلیم کر لینے میں آئندہ پیش آسکتے تھے۔ جس کی بعد آزاں روک تھام نہایت مشکل تھی۔ چنانچہ ابوالکلام آزاد جو خواہش اور تمنا رکھتے تھے اس کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکے۔''''

برِ صغیر میں ہارس ٹریڈ نگ کے بانی، مولاناابوالکلام آزاد

آج کل کے گئے گذرے دور میں بھی جبکہ کسی پارٹی کی طرف سے منتخب شخص کا اپنی پارٹی چھوڑنا قابل مذمت بات ہے اور اس شخص کے لیے شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔ ایسے فرد کے لیے لوٹا تک کے قابل مذمت الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی اکثریتی پارٹی کو محروم رکھ کر اقلیتی پارٹیوں کا منصوبہ تیار کرکے حکومت ان کے ہاتھ میں تھمادینا بھی کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے۔ ایسی باتیں آج سے ستر اسی سال قبل شاید سوچنا بھی محال ہو۔ مگر وائے حیرت کہ کئی دہائیاں قبل جب یہ سب کچھ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا مولاناآزاد نے نہ صرف یہ کارہائے نمایاں سر انجام دیئے بلکہ وہ اسے اپنی کتاب ''آزادی ہند'' میں اپنے لیے قابلِ فخر بھی ثابت کرتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا یا پھر یہ مقولہ کہ محبت، سیاست اور جنگ میں سب جائز ہے۔ مولانا آزاد نے ان بے اصولیوں پر ان اچھے وقتوں میں بھی عمل کر دکھایا۔ آیئے اس کی تفصیل مولاناہی کی زبانی سنتے ہیں۔ مولاناآزاد ''آزادیِ ہند'' میں 1937ء کی کانگریسی وزارتوں کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

''یو پی میں مسلم لیگ کو بڑی کامیابی ملی جس کی بڑی وجہ جمعیت العلماء ہند کا تعاون تھا۔ جمعیت نے لیگ کی حمایت اس تاثر کے ساتھ کی تھی کہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے گی۔ اس وقت یو پی میں چودھری خلیق الزمان اور نواب اسماعیل خاں مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ جب حکومت کی تشکیل کے لیے میں لکھنو آیا

تو میں نے دونوں سے بات کی۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ کانگریس سے صرف تعاون ہی نہ کریں گے بلکہ مکمل طور پر کانگریس پروگرام کی حمایت بھی کریں گے۔ انہیں فطری طور پر توقع تھی کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ کا کچھ حصہ ہو گا۔ مقامی صورتِ حال ایسی تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی تنہا حکومت میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یا تو دونوں کو لیا جاتا یا پھر کسی کو نہیں۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ دونوں حکومت میں شامل کر لیے جائیں گے۔ اگر وزارت کو صرف سات اراکین پر مشتمل ہونا تھا تو دو مسلم لیگی ہوں گے باقی سب کانگریسی۔ نو افراد کی کابینہ میں کانگریس کی اکثریت اور بھی زیادہ نمایاں ہو گی۔ مجھ سے گفتگو کے بعد اس ضمن میں ایک نوٹ تیار کیا گیا کہ مسلم لیگ پارٹی کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے گی اور کانگریس پروگرام کو قبول کرے گی۔ نواب اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزمان دونوں نے دستاویز پر دستخط کیے اور میں لکھنؤ سے پٹنہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کیونکہ بہار میں وزارت کی تشکیل کے لیے میری موجودگی ضروری تھی۔

''چند روز بعد میں آلہ آباد واپس آیا اور یہ معلوم کر کے مجھے شدید افسوس ہوا کہ جواہر لال نے خلیق الزمان کو اور نواب اسماعیل خاں کو لکھ دیا تھا کہ دونوں میں سے صرف ایک وزارت میں جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ فیصلہ مسلم لیگ کو کرنا تھا کہ کس کو شامل کیا جائے۔ مگر میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کی روشنی میں دونوں میں سے کوئی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ تنہا شامل ہو جائے۔ چنانچہ دونوں نے معذرت کر لی اور کہا کہ جواہر لال کی پیش کش کو قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک انتہائی افسوس ناک واقعہ تھا۔

اگر لیگ کی تعاون کی پیش کش قبول کر لی گئی ہوتی تو عملی مقاصد کے اعتبار سے مسلم لیگ کی پارٹی کانگریس میں ضم ہو گئی ہوتی۔ جواہر لال کے اس عمل نے یو پی میں مسلم لیگ کو ایک نئی زندگی عطا کر دی۔ ہندوستانی سیاسیات کے تمام طالب علم یہ جانتے ہیں کہ لیگ کی تنظیمِ نو یو پی ہی سے ہوئی۔ مسٹر جناح نے موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور ایک جارحانہ کارروائی شروع کر دی جس نے انجام کار پاکستان بنوایا۔

''میں نے جواہر لال کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے موقف میں ترمیم کر لیں۔ میں نے ان سے کہا کہ لیگ کو وزارت میں شامل نہ کر کے انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں نے انہیں خبردار بھی کیا کہ ان کے اس فعل کے نتیجے میں مسلم لیگ میں ایک نئی جان آ جائے گی اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کے راستے میں نئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ جواہر لال نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا اور اس پر قائم رہے کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔ انہوں نے یہ دلیل دی کہ صرف چھبیس ممبروں کی طاقت پر مسلم لیگ کابینہ میں ایک سے زیادہ نشست کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ مسٹر جناح نے صورتِ حال کا پورا فائدہ اٹھایا اور پوری لیگ کو کانگریس کے خلاف کر دیا۔ انتخابات کے بعد ان کے بہت سے حامی اس نقطے تک پہنچ گئے تھے کہ جناح سے الگ ہو جائیں لیکن اب جناح کو انہیں اپنے حلقے میں شامل کرنے کا دوبارہ موقع مل گیا۔''

حسبِ عادت مولانا آزاد نے اصل واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ پارٹی کی طرف سے کسی موقع پر بھی نواب اسماعیل خاں نے یا چودھری خلیق

الزمان نے انفرادی حیثیت میں اپنی وزارتوں کے حصول کے لیے کوئی گفت وشنید نہیں کی تھی۔ مولانا آزاد اور جواہر لال دونوں سے جو گفتگو ہوئی وہ جماعتی حیثیت میں تھی۔ جواہر لال کانگریس کی کامل اکثریت ہونے کی وجہ سے مخلوط حکومت کے خلاف تھے البتہ انفرادی حیثیت سے وہ مسلم لیگ کے ممبران کو وزارت میں اس شرط پر لینے کے لیے تیار تھے کہ وہ اپنی پارٹی توڑ کر کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ مگر دونوں نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ پھر یہ دعویٰ بھی کہ دونوں اصحاب نے کانگریسی کا پروگرام منظور کر کے کسی مسودے پر دستخط کر دیئے تھے، خلافِ واقعہ ہے۔ 1959ء میں اخبار ''ہندو'' کے سوال کے جواب میں نہرو نے کہا تھا کہ ایسا کوئی معاہدہ ہوا ہی نہیں تھا جس پر دستخط کی نوبت آتی۔ دوسری طرف چودھری خلیق الزمان نے بھی اس بات سے انکار کیا تھا کہ انہوں نے کسی مسودے پر دستخط کیے تھے۔

مولانا آزاد نے یہ بھی فرمایا کہ یوپی میں جمعیت العلماء ہند نے لیگ کا اس لیے ساتھ دیا تھا کہ انہیں امید تھی کہ الیکشن کے بعد لیگ کانگریس سے تعاون کرے گی۔ ہو سکتا ہے جمعیت کو ایسی کوئی امید ہو مگر قرائن اس بات کی تصدیق نہیں کرتے۔ کیونکہ یہی الیکشن تھے جب مولانا حسین احمد مدنی نے فرمایا تھا ''جو مسلمان مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دے گا وہ دونوں جہاں میں روسیاہ ہو گا۔'' بہر حال قائدِ اعظم نے تو تعاون کی پیش کش کی تھی۔ وہ تو نہرو تھے جنہوں نے جیت کے نشے میں قائد اعظم کی پیش کش یہ کہہ کر ٹھکرا دی تھی کہ ''ہندوستان میں دو طاقتیں ہیں ایک حکومت اور دوسری کانگریس۔'' جس کے جواب

میں قائداعظم نے کہا تھا۔ ''ایک تیسری قوت بھی ہے وہ مسلم لیگ ہے۔'' اس کے باوجود قائدِ اعظم نے گاندھی جی سے اس معاملے میں مداخلت کو کہا تھا مگر انہوں نے بھی یہ کہہ کر قائدِ اعظم کا ہاتھ جھٹک دیا کہ ''مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔'' قائدِ اعظم تو تعاون کو تیار تھے لیکن کانگریس آمادہ نہ ہوئی۔ اس پورے معاملے میں ایک اہم چیز کو معلوم نہیں کیوں مولانا نے بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ اس کا تعلق بھی اسی صوبے یوپی سے تھا۔ وہ تھا حافظ ابراہیم کا معاملہ۔ حافظ ابراہیم صاحب مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ انہیں مولانا آزاد نے مسلم لیگ سے استعفیٰ دلا کر اس شرط کے ساتھ کانگریس میں شامل کرایا کہ وہ وزارت میں لیے جائیں۔ مولانا حفظ الرحمان حافظ ابراہیم کے بہنوئی تھے اور مولانا بشیر احمد کٹھوڑی ان کے خاص دوست اور جمعیت العلماء ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ان دونوں اصحاب نے مولانا آزاد کے ذریعے کانگریس سے معاملہ کر لیا۔ حافظ ابراہیم صاحب کے مسلم لیگ سے استعفیٰ نے ہی کانگریس اور لیگ کے درمیان تعاون کو ناممکن بنا دیا تھا۔ اس دور میں یہ ایک عجیب واقعہ تھا اور لیگ نے اسے اپنے اوپر جارحانہ اقدام تصور کیا اور لیگ اور کانگریس میں ٹھن گئی۔ جب تمام ملک نے اس اقدام کو بری نظر سے دیکھا تو حافظ ابراہیم نے اس کی تلافی اس طرح کرنا چاہی کہ اپنی سیٹ سے مستعفی ہو کر دوبارہ انتخاب لڑا مگر اس طرح کہ وزارت پر بدستور قائم رہے اور اپنے وزارتی اثرات سے کام لے کر ضمنی انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔

یہ تھا مولانا کا کارنامہ۔ ان کا کام بس یہی رہ گیا تھا کہ مسلم لیگ کے ممبران کو وزارت کا لالچ دے کر انہیں لیگ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر چودھری خلیق الزمان اور نواب محمد اسماعیل خاں وزارت کے لالچ میں مسلم لیگ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے تو یہ ان کی عظمت تھی۔ مولانا نے اپنی طرف سے پوری کوشش کرلی۔ جب وہ نہیں مانے تو مولانا الٹا نہرو پر الزام دھرنے لگے۔ یہی کچھ کانگریس نے سی پی میں کیا تھا۔ جہاں مسٹر محمد شریف جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے انہیں بھی حافظ ابراہیم کی طرح وزارت کا لالچ دے کر لیگ سے استعفیٰ دلادیا تھا۔ پھر مسٹر شریف کو جس طرح ذلیل کر کے نکالا گیا وہ ایک عبرت انگیز واقعہ ہے۔ ہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہی دو واقعات مسلم لیگ میں نئی جان ڈالنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ مسلمانانِ ہند نے سمجھ لیا کہ ان کی رائے کا احترام نہیں ہو رہا اور وہ یک جان ہو کر مسلم لیگ کی پشت پر آ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد تمام ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ نے کانگریس کو شکست دی۔ پھر وزارتوں کے لالچ، کسی حرص و تحریص، برلا اور بجاج کی تجوریوں کے باوجود کانگریس کو مسلم لیگ کی صفوں سے کوئی غدار نہ مل سکا۔ مسلم لیگ آگے ہی آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ 1946ء کے انتخابات میں تمام مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل کر کے قیامِ پاکستان کی منزل آسان کر دی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ 1946ء کے انتخابات میں بھی پیش آیا جسے مولانا آزاد نے اپنا کارنامہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی کے متعلق مولانا آزاد ''آزادی ہند'' میں فرماتے ہیں۔ ''جیسا

کہ عام طور پر توقع تھی کانگریس کو سوائے بنگال، پنجاب اور سندھ کے تمام صوبوں میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ان تین صوبوں میں پوزیشن الجھی ہوئی تھی۔ بنگال میں مسلم لیگ واحد سب سے بڑی پارٹی تھی اور اس نے تقریباً آدھی نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کی تعداد تقریباً یکساں تھی اور پلہ برابر تھا۔ سندھ میں بھی مسلم لیگ نے بڑی تعداد میں نشستیں جیتیں لیکن اسے اکثریت نہیں مل سکی۔ شمال مغربی صوبہ سرحد میں جہاں مسلم اکثریت سب سے بڑی تھی۔ لیگ کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور کانگریس حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔"

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے ان فرمودات پر تبصرہ کر لیا جائے تاکہ تقریباً یکساں، تقریباً آدھی، اکثریت نہیں ملی، کانگریس حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی، جیسے جملوں کی حقیقت واضح ہو جائے۔ مولانا آزاد نے اپنی روایتی رنگ آمیزی سے تاریخی حقائق کو ہی مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ بنگال کے متعلق مولانا نے فرمایا۔ "بنگال میں مسلم لیگ واحد سب سے بڑی پارٹی تھی اور اس نے تقریباً آدھی نشستوں پر قبضہ کر لیا۔" بنگال میں کل 119 مسلم نشستیں تھیں جن میں سے 112 مسلم لیگ نے جیت لی تھیں۔ کیا خوب ہے کہ 119 میں سے 112 سیٹوں کو مولانا نے تقریباً آدھی فرما دیا۔ اسی طرح پنجاب کے متعلق فرمایا۔ "پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کی تعداد تقریباً یکساں اور پلہ برابر تھا۔" حالانکہ پنجاب میں کل 86 مسلم نشستیں تھیں جن میں سے 79 مسلم لیگ نے جیت لی تھیں جبکہ یونینسٹ پارٹی کے صرف 5 ممبر کامیاب ہو

سکے تھے۔ یہاں بھی مولانا نے اپنی بلاغت سے 79 اور 5 سیٹوں کو تقریباً یکساں بنا دیا۔ اسی طرح سندھ کے متعلق بیان کیا۔ ''سندھ میں بھی مسلم لیگ نے بڑی تعداد میں نشستیں جیتیں لیکن اسے اکثریت نہیں مل سکی۔'' حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں کل 34 مسلم نشستیں تھیں جن میں سے 29 مسلم لیگ کے پاس تھیں اور 5 مسٹر سید کی ترقی پسند مسلم لیگ نے حاصل کی تھیں۔ پھر سرحد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ ''سرحد میں جہاں مسلم اکثریت سب سے بڑی تھیں لیگ کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور کانگریس حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔'' یہاں پر مولانا نے مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ درست ہے کہ کانگریس سرحد کے گورنر کی مدد اور آزاد آراکین کو ملا کر خان حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ مگر یہ کہنا کہ لیگ کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں تاریخ کے ساتھ مذاق ہے۔ سرحد میں پارٹی پوزیشن یہ تھی۔ مسلم لیگ 17، کانگریس 16، جمعیت العلماء 2 اور آزاد ایک۔ یہاں 17 سیٹوں کے ساتھ مسلم لیگ سب سے بڑی پارٹی تھی مگر مولانا یہاں مسلم لیگ کو ناکام قرار دیتے ہیں۔ یہ ہے مولانا کی تاریخ نویسی۔ یہ تو تھا مولانا کے دیئے گئے اعداد و شمار کا تجزیہ۔ اصل کہانی آگے ہے۔ مولانا آزاد آگے چل کر ''آزادیٔ ہند'' میں فرماتے ہیں۔

''پنجاب میں صورتِ حال بالخصوص مشکل تھی۔ یہ ایک مسلم اکثریتی صوبہ تھا مگر کسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہیں تھی۔ مسلم اراکین، یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ میں تقسیم تھے۔ میں نے دونوں گروپوں سے بات چیت کی۔ لیگ نے جیسا کہ میں نے پہلے کہا

ہے مسٹر جناح کی ہدایت کے تحت میرا دعوت نامہ قبول نہیں کیا مگر کسی نہ کسی طرح میں مذاکرات کو اس انداز سے چلانے میں کامیاب ہو گیا جس نے کانگریس کی مدد سے یونینسٹ پارٹی کو وزارت بنانے کا موقع فراہم کر دیا۔ گورنر شخصی طور پر مسلم لیگ کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے مگر انہوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی اور صورت نہیں سوائے اس کے کہ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ خضر حیات خاں کو حکومت کی تشکیل کے لیے مدعو کیا جائے۔

''یہ پہلا موقع تھا جب پنجاب میں کانگریس حکومت میں شریک ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جسے اس وقت تقریباً ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔ ملک بھر میں سیاسی حلقوں نے اعلان کیا کہ میں نے ان مذاکرات میں، جنہوں نے پنجاب وزارت کی تشکیل کا راستہ دکھایا، زبردست صلاحیت اور تدبر کا ثبوت دیا ہے۔ پورے ملک میں آزاد آراکین نے غیر مشروط طور پر مجھے مبارکباد دی۔ نیشنل ہیرالڈ نے جو یوپی کانگریس کا ترجمان ہے مجھے اس بات پر سراہا کہ میں نے سلیقے کے ساتھ پنجاب کے پیچیدہ اور مشکل ترین مسئلے کو حل کیا تھا اور یہاں تک کہا کہ میں نے جس طرح صورتِ حال کو نمٹایا ہے اور وہ کسی بھی کانگریسی لیڈر کی طرف سے مذاکرات میں تدبر اور ہوشیاری کی واضح ترین مثالوں میں سے ایک تھا۔

''جواہر لال جیسا کہ گرم جوش اور فیاض ہیں اور ان کے دماغ میں ذاتی حسد نے کبھی گھر نہیں کیا۔ بہر حال ان کے بعض اعزاء و احباب مجھ سے ان کے قریبی تعلقات پسند نہیں کرتے تھے اور ہمارے درمیان رقابتیں اور مشکلات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جواہر لال میں یہ کمزوری ہے کہ وہ اصولی مصلحتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان لوگوں نے اسی کمزوری

کا فائدہ اٹھا کر انہیں میرے خلاف کرنا چاہا۔ان لوگوں نے ان سے بات کی اور کہا کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کا اتحاد اصولاً غلط تھا۔ان کا استدلال تھا کہ مسلم لیگ ایک عوامی تنظیم تھی اور کانگریس کو پنجاب میں لیگ سے مل کر حکومت بنانی چاہیئے تھی نہ کہ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر۔ کمیونسٹوں نے کھلم کھلا ہی لائن اختیار کی۔ جواہر لال جزوی طور پر ان کے خیالات سے متاثر ہوئے تھے اور ہو سکتا ہے انہوں نے سوچا ہو کہ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ مخلوط حکومت بنا کر میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اصولوں کی قربانی دے رہا ہوں۔

''مجھے نہیں معلوم کہ جواہر لال کے ذہن پر اس تلقین کا اثر کس حد تک پڑا مگر بمبئ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے دوران میں نے دیکھا کہ کم و بیش ہر معاملے پر انہوں نے میرے طرزِ عمل کی مخالفت شروع کر دی۔ جواہر لال نے یہ رخ اپنایا کہ پنجاب میں میں نے جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہیں تھی۔انہوں نے یہاں تک کہا کہ میں نے کانگریس کے وقار کو گرا دیا ہے۔ مجھے یہ سن کر تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ میں نے پنجاب میں جو کچھ کیا تھا اس لیے کیا تھا کہ کانگریس حکومت میں شامل ہو جائے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ گورنر مسلم لیگ کی وزارت قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے میری ہی جد وجہد کے نتیجے میں مسلم لیگ کو ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا اور کانگریس نے اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی پنجاب کے معاملات میں ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل کر لی

تھی۔ خضر حیات خان کانگریس کی مدد سے وزیر اعلیٰ بنے تھے اور ظاہر ہے کہ کانگریس کے اثر میں تھے۔''

یہ ہے مولانا کا کارنامہ جس پر وہ بے انتہا خوش ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ پنجاب کی 86 مسلم نشستوں میں سے 81 مسلم لیگ نے جیت لی تھیں اور یونینسٹ کے صرف پانچ ممبر کامیاب ہوئے تھے۔ مگر مولانا فرماتے ہیں مسلم ممبر مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں بٹے ہوئے تھے، حقائق کا منہ چڑانا ہے۔ اس صوبے میں کل نشستیں 177 تھیں۔ مسلم لیگ 86 اور بقیہ سکھ، ہندو اور مشترک حلقے۔ مسلم لیگ 86 سیٹوں میں سے 81 جیت چکی تھی۔ اس صوبے میں وزارت سازی کے لیے 88 ارکان چاہئیں تھے۔ مسلم لیگ کو مزید 7 ارکان کی حمایت درکار تھی۔ یہ سات ارکان اسے ملنا مشکل نہ تھا۔ پھر مولانا کا یہ کہنا کہ گورنر مسلم لیگ کا حامی تھا وہ لیگ کے لیے کوششیں کر رہا تھا۔ بالکل غلط ہے۔ وہ مسلم لیگ کا حامی ہوتا تو 7 آزاد ارکان آسانی سے دلا سکتا تھا۔ مگر 1944ء میں وہ پہلے بھی پنجاب کے معاملے میں مسلم لیگ کی مخالفت کر چکا تھا۔ لہٰذا اب بھی وہ لیگ کا حامی نہیں تھا۔ پھر قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کی اصول پرستی کا یہ حال تھا کہ یونینسٹ پارٹی نے لیگ سے اتحاد کی خود خواہش کی تھی اور صرف ایک وزارت مانگی تھی لیکن قائدِ اعظم نے انکار کر دیا اور کہا تھا غیر مسلموں سے اتحاد کر لیں گے مگر یونینسٹ سے نہیں۔ دوسری طرف مولانا آزاد کے کمالات کہ 17 ہندو اور کئی سکھ ارکان کو اکٹھا کر کے 5 سیٹوں والے حضرت حیات

خان کے ماتحت کر کے اسے وزیر اعلیٰ بنوادیا۔ واقعی مولانا کا یہ کارنامہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

ادھر مولانا یہ بھی بتاتے ہیں کہ خود کانگریس کا ایک حلقہ بھی اسے بے اصولی سمجھتا تھا یہاں تک کہ نہرو نے بھی اسے پسند نہیں کیا۔ مگر مولانا ہیں کہ اسے اپنے کارنامے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لگتا ہے ان کا مقصد ہی یہی رہ گیا تھا کہ جیسے بھی بن سکے مسلم لیگ اور قائدِ اعظم سے اپنے اختلافات کا بدلہ لیا جائے چاہے اس سے مسلمانوں کے مفادات کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہی یونینسٹ حکومت تھی جس نے سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر مظالم ڈھائے اور اسی بندوبست کی وجہ سے بعد میں پنجاب کی ایسی تقسیم ہوئی جس سے خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ واہ مولانا واقعی یہ آپ کا عظیم کارنامہ تھا۔ اصول پسندی اور اخلاقیات کا چاہے جنازہ نکل جائے مگر سیاسیات میں آپ کامیاب ٹھہرے۔

قائدِاعظم اور امام الہند کے خطابات

قارئین مضمون کے عنوان سے کہیں اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں کہ کہیں میں قائدِاعظم محمد علی جناح اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیات کا کوئی تقابل پیش کرنے لگا ہیں۔ بلکہ جس طرح سابقہ مضامین میں ہم نے مولانا آزاد کے متضاد اور غیر حقیقی بیانات پر تنقید کی تھی اسی طرح اس مضمون میں بھی مولانا کے قائدِاعظم سے متعلق بعض من گھڑت اقتباسات کا تجزیہ پیش کیا ہے اور ان کے امام الہند بننے کی خواہش اور کوششوں کا تذکرہ بیان کیا ہے۔ مولانا آزاد کے خلاف سخت ترین جملے کہنے والی دو ہی شخصیات تھیں اور اتفاق سے دونوں محمد علی تھے۔ ایک مولانا محمد علی جوہر جنہوں نے مولانا آزاد کے متعلق نہرو رپورٹ کی حمایت کرنے پر 10 جنوری 1929ء کو ہمدرد میں ''رودادِ چمن'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھا۔

''پنڈت مالوی جی نے امیر آباد جاتے ہوئے کانپور سے ایک تار ہمارے نام بھیجا جس میں ہم سے درخواست کی گئی کہ ہم سے علیحدگی اختیار نہ کریں اور جو کچھ مسلمانوں کے مطالبات ہوں ان کو پیش کریں۔ اس کا جواب ان کو یہ دیا گیا کہ ہم کو جو کچھ کہنا اور کرنا تھا وہ کر چکے اور کہہ چکے۔ اب اگر مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنا مقصود ہے تو غیر متعصب ہندو لیڈر اٹھیں اور متعصب ہنود کو سمجھا دیں۔ اس تار پر ان مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی دستخط ثبت تھے جو ہنود کی زیادتیوں کے بارے میں عرصہ سے دہنِ مبارک پر سکوت لگا کر ''ابوالکلام آزاد'' کی جگہ ''ابوالسکوت اسیر'' بنے بیٹھے ہیں اور جنہوں نے واللہ علم بالصواب بقول

راویانِ ثقہ کنونشن کا تماشہ ختم ہونے پر فرمایا کہ ''مسلمان احمق تھے کہ وہ کنونش کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنے آئے اور ہندو احمق تر تھے کہ انہوں نے ایسے مطالبات کو قبول نہ کیا''۔ جس کے یقینا'' معنی یہ ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد عقلمند ترین شخص ہیں کہ بالکل خاموش رہے اور بولے بھی تو ایک مشہور لطیفے کے امام کی طرح جس کے سارے مقتدی نماز میں بول اٹھے تھے اور جس نے کہا تھا کہ شکر ہے میں نہیں بولا۔''

اور دوسرے قاعدِ اعظم محمد علی جناح جنہوں نے مولانا آزاد کی ہندو مسلم مسئلے کے متعلق گفتگو کرنے کی دعوت پر انہیں لکھا تھا۔ ''آپ کا ٹیلیگرام اعتماد پیدا نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے خط و کتابت یا کسی اور طریقے پر گفت و شنید سے انکار کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ مسلم ہندوستان کا قطعی طور پر اعتماد کھو چکے ہیں۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ آپ کو ''کانگریس کا مسلم شو بوائے'' صدر اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس بات کو رنگ دے کر بیرونی دنیا کو دھوکہ دیا جاسکے کہ یہ نیشنل کانگریس ہے۔آپ نہ مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ ہندوؤں کی۔ کانگریس ایک ہندو جماعت ہے۔ اگر آپ میں عزتِ نفس ہے تو فوراً مستعفی ہو جائیں۔اب تک آپ نے لیگ کے ساتھ بد ترین سلوک کیا ہے۔آپ کو علم ہے کہ آپ بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔اسے چھوڑ دیجئے۔'' مولانا آزاد کو یقینا'' اس کا صدمہ ہوا ہو گا۔ اگر وہ اس جملے کا جواب دے سکتے تو شاید ان کی تسلی ہو جاتی مگر حالات اس وقت ایسے تھے کہ تمام دنیا انہیں کانگریس کا نمائشی صدر سمجھ رہی تھی۔ اس لیے وہ اس وقت اس کا جواب نہ دے سکے۔ مگر قائدِ اعظم کا یہ جملہ ایسا تیرِ نیم کش بن کر رہ گیا کہ

آخر وقت اس کی خلش ان کو بے چین کرتی رہی اور پھر ''آزادی ہند'' کی تالیف شاید اسی محرک کا نتیجہ ہے کہ مولانا بتلا سکیں وہ ہر گز شو بوائے نہ تھے۔ اس کتاب کے ایک ایک جملے میں اسی جملے کی صدائے باز گشت سنائی دیتی ہے اور وہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کانگریس کے کرتا دھرتا وہی تھے اور گاندھی، نہرو اور پٹیل وغیرہ ان کے بستہ بردار تھے۔

محمد علی جوہر کے جملے ''ابوالسکوت اسیر'' کا بدلہ بھی اس طرح لیا کہ ''آزادی ہند'' میں ان کی تحریکِ آزادی کے لیے کی گئی خدمات کا ذکر تو خیر کیا کرتے بلکہ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے لیے ان کی محنت کو گاندھی کی جھولی میں ڈال دیا۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور یہ دکھلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قائدِ اعظم کو قائدِ اعظم کا خطاب کس طرح ملا اور مولانا آزاد کیسے اور کب امام الہند کہلائے۔

مولانا آزاد ''آزادی ہند'' میں فرماتے ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ اس موقع پر مسٹر جناح کی طرف گاندھی جی کا بڑھنا ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔ اس نے جناح کو ایک نئی اور مزید اہمیت عطا کر دی جس کا انہوں نے بعد میں پورا فائدہ اٹھایا۔ گاندھی جی نے جناح کی طرف دراصل شروع ہی سے عجیب و غریب رویہ اپنائے رکھا۔ دوسری دہائی میں کانگریس سے علیحدگی کے بعد جناح اپنی سیاسی اہمیت کھو بیٹھے تھے۔ اس کی بہت بڑی وجہ گاندھی جی کے بعض اقدامات اور غلطیاں تھیں کہ

جناح نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اپنی اہمیت پھر سے حاصل کرلی۔ واقعتاً "اس بات میں شک ہے کہ گاندھی جی کے رویے کے بغیر جناح کو کبھی یہ برتری حاصل ہو پاتی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے وسیع حلقے مسٹر جناح اور ان کی پالیسی کے متعلق شکوک رکھتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ گاندھی جی ان کے پیچھے مسلسل بھاگ رہے ہیں اور انہیں خوش کرنے میں لگے ہیں تو بہتوں کے دل میں جناح کے لیے نئی عزت پیدا ہو گئی۔ ان کا خیال تھا فرقہ وارانہ مفاہمت میں مقید طلب شرطوں کی تکمیل کے لیے جناح شاید بہترین شخص ہیں۔

"جب 1944ء میں نے یہ رپورٹ پڑھی کہ گاندھی جی جناح سے خط و کتابت کر رہے ہیں اور ان سے ملاقات کے لیے بمبئی جارہے ہیں تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گاندھی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کا یہ فعل مسئلوں کو حل نہیں کرے گا بلکہ اس کے برخلاف ہندوستانی سیاسی صورتِ حال دشوار تر بنادے گا۔ جناح نے اس صورتحال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خود اپنی پوزیشن بنالی لیکن انہوں نے ایک بھی ایسی بات نہ کی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے معاون ثابت ہو سکتی۔"

مولانا آزاد کے اس پورے تبصرے سے تو لگتا ہے کہ اگر گاندھی جی قائدِ اعظم سے خط و کتابت یا ملاقات نہ کرتے تو قائدِ اعظم کو کوئی جاننے والا نہ ہوتا۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں قائدِ اعظم کو جو اہمیت حاصل ہوئی وہ نہ گاندھی جی کا عطیہ تھی اور نہ گاندھی جی کی غلطی کا نتیجہ۔ قائدِ اعظم نے جو بھی مقام حاصل کیا وہ اپنی دیانتِ فکر، اصابتِ رائے اور بے داغ

کریکٹر کی وجہ سے تھا۔ یہ تو مولانا بھی مانتے ہیں کہ قائدِ اعظم کی اہمیت کانگریس سے علیحدگی کے بعد کم ہوئی اس سے پہلے وہ اپنا مقام ہندوستانی سیاست میں بنا چکے تھے۔ جس وقت قائدِ اعظم کانگریس میں شامل ہوئے اس وقت ان کے دو بڑے حریف، گاندھی جی افریقہ میں انگریزوں کے لیے رنگروٹ بھرتی کر رہے تھے اور نہرو ابھی قانون کی تعلیم پا رہے تھے۔ 1906ء میں جب گاندھی پہلی بار ہندوستان آئے تو جس بھی اجلاس میں انہیں بلایا جاتا قائدِ اعظم پہلے سے نمایاں جگہ موجود ہوتے۔ پھر دوسری بار جب انہوں نے افریقہ کو خیر باد کہا اور یہاں ہمیشہ کے لیے آئے تو بھی ان کی منہ دکھلائی کے لیے بلائے گئے اجلاس کی صدارت قائدِ اعظم سے کرائی گئی تا کہ لوگ اکٹھے کیے جا سکیں۔

قاعدِ اعظم نے اپنی اہمیت اس وقت بنوائی جب 1913ء میں قانون ساز اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے مسلمانوں کے ایک دیرینہ مسئلہ، جو 1873ء سے چلا آرہا تھا، کے سلسلے میں ''قانون وقف علی الاولاد'' کا بل منظور کرایا اور یاد رہے یہ ایک فقہی مسئلہ تھا اور قائدِ اعظم نے مجلس میں اس مسئلے پر جو تقریریں کیں وہ ان کے اسلامی فقہ سے واقفیت کی دلیل ہیں۔ پھر 1916ء میں کانگریس لیگ کے درمیان معاہدہِ لکھنو کرا کر ''ہندو مسلم اتحاد کے سفیر'' کہلائے۔ اسی طرح 1918ء میں بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگٹن سے ان کی چپقلش اور دسمبر میں اس کے الوداعی جلسے کو درہم برہم کرنا ایک یادگار واقعہ ہے۔ اسی بہادری کے صلے میں کانگریس کے چندے سے بمبئی میں جناح میموریل ہال تعمیر کیا گیا۔ جس کے افتتاح کے موقع پر قائدِ اعظم ہندوستان میں موجود نہ تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو نے ہال کا

افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''جناح ہندو مسلم اتحاد کا سفیر ہے اور ایسی خوش نصیب شخصیت ہے جس کے ہم وطنوں نے اپنے وطن اور اس کی حیات ہی میں قدر کی ہے۔'' ڈاکٹر اینی بسنت نے کہا تھا۔ ''جناح جیسی شخصیتیں بنی نوعِ انسان کی آزادی کے گلے کا ہار ہیں جن کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔'' اور مسز سروجنی نائیڈو نے قائدِ اعظم کو تار دیا جس میں لکھا۔ ''پیغمبر کی زندگی ہی میں قوم نے اس کی قدر پہچان لی۔''

ہاں نہرو رپورٹ کے بعد مسلمان رہنماؤں کی آپس کی پھوٹ اور اختلافات نے انہیں ضرور دل برداشتہ کیا اور وہ انگلستان چلے گئے۔ 1933ء میں ہندوستان میں کوئی ایسا لیڈر نہ تھا جو مسلم لیگ کی قیادت کر سکتا۔ حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر، راجہ صاحب محمود آباد اور سر محمد شفیع اس قابل تھے مگر وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ آخر لیگ کے سالانہ اجلاس میں قرارداد کے ذریعے قائدِ اعظم کو واپس بلانے اور انہیں مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کی تجویز پاس ہوئی۔ 1934ء میں قائدِ اعظم ہندوستان آئے اور حالات کا جائزہ لے کر واپس چلے گئے۔ آخر 1935ء میں واپس آکر لیگ کی قیادت سنبھال لی۔ ابھی لیگ کی تنظیم سازی جاری تھی کہ الیکشن کا مرحلہ آگیا۔ اس الیکشن میں اگرچہ مسلم لیگ 485 مسلم نشستوں میں سے 102 ہی جیت سکی مگر قائدِ اعظم کا پیغام ''اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم'' برِ صغیر کے کونے کونے میں پہنچ چکا تھا۔

اسی الیکشن میں شکست کے بعد جب قائدِ اعظم نے گاندھی سے درخواست کی کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے کوشش کریں تو اس وقت گاندھی نے جواب دیا تھا۔ ''مجھے چاروں

طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ مجھے افسوس ہے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' یہ تھا جیت کا نشہ۔ مگر بعد کے ضمنی انتخاب میں 5 جگہوں پر مسلم لیگ نے کانگریس کو شکست دی تو حالات بدلنے لگے۔ کلکتہ کے لیگ کے کھلے اجلاس میں 2لاکھ سے زیادہ افراد کا جوش دیکھ کر گاندھی کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے قائدِاعظم کو خود تار بھیجا۔ اگر قائدِاعظم کی کوئی اہمیت نہ تھی تو خود مولانا آزاد نے اکتوبر 1939ء میں انہیں دو بار کیوں خطوط لکھے۔ پھر 1940ء کا ٹیلیگرام کس لیے تھا جس کے جواب میں قاعدِاعظم نے ''شو بوائے'' کے فقرے والا خط لکھا تھا۔ جس وقت گاندھی جی 1944ء میں قائدِاعظم سے خط وکتابت اور ملاقاتیں کر رہے تھے جس کا حوالہ مولانا آزاد نے دیا ہے اس وقت تو حالات ہی بدل چکے تھے۔ قائدِاعظم رابطۂ عوام مہم کے ذریعے ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری امید بن چکے تھے۔ کرپس مشن کا آنا ان کی کامیابی کی دلیل تھی۔ دوسری طرف کانگریس 1942ء کی ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک میں ناکام ہو چکی تھی۔اس لیے گاندھی کا قائدِاعظم سے ملنا ازراہِ مجبوری تھا۔

مولانا آزاد کا یہ جملہ بھی حیران کن ہے کہ ''جب ان مسلمانوں، جن کے دل میں جناح کے متعلق شکوک تھے، نے یہ دیکھا کہ گاندھی ان کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور انہیں خوش کرنے میں لگے ہیں تو ان کے دل میں جناح کے لیے نئی عزت پیدا ہو گئی۔'' جو مسلمان گاندھی کے اتنے عقیدت مند تھے کہ ان کی وجہ سے قائدِاعظم کی عزت کرنے لگے، انہوں نے براہِ راست گاندھی کے سامنے سرِعقیدت کیوں نہ جھکا دیا۔ یعنی گاندھی جی کی

وجہ سے قائدِ اعظم کو زعیم کبیر مانا اور پھر قائدِ اعظم کی وجہ سے گاندھی سے منحرف ہو گئے۔ کیسی عجیب منطق ہے۔

مولانا آزاد ''آزادئ ہند'' میں مزید فرماتے ہیں۔ '' یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ گاندھی جی ہی تھے جنہوں نے مسٹر جناح کے لیے سب سے پہلے قائدِ اعظم یعنی بہت بڑے لیڈر کے خطاب کو رواج دیا۔ گاندھی کے کیمپ میں ایک بے وقوف لیکن نیک صفت خاتون تھیں جن کا نام امت السلام تھا۔ اس نے اردو اخبارات میں جناح کا ذکر قائدِ اعظم کے طور پر دیکھا تھا۔ جس وقت گاندھی جی ملاقات کے لیے جناح کو خط لکھ رہے تھے، اسی خاتون نے گاندھی جی سے کہا اردو اخبارات جناح کو قائدِ اعظم لکھتے ہیں۔ آپ بھی انہیں اسی نام سے خطاب کریں۔ اس اقدام کے مضمرات پر ایک لمحے کے لیے بھی غور کیے بغیر گاندھی جی نے جناح کو قائدِ اعظم کے نام سے خطاب کیا۔ یہ خط جلد ہی اخباروں میں چھپ گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ گاندھی جی بھی جناح کو قائدِ اعظم کہتے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ وہ سچ مچ قائدِ اعظم ہیں۔ ''

مذکورہ خط 1940ء کا ہے جبکہ تحریروں و ثبوتوں کے مطابق 7 دسمبر 1936ء کو مراد آباد کی جامع مسجد میں مولانا احمد سعید نے پہلی بار یہ خطاب قائدِ اعظم کے لیے استعمال کیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلم لیگ کے ورکروں کا ایک نعرہ بن گیا۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں قائدِ اعظم زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے اور 1938ء کے مسلم لیگ کے پٹنہ

اجلاس تک یہ نعرہ مقبولیت کے عروج پر تھا۔ اور میاں فیروز الدین ہر اجلاس میں قائدِ اعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔

ایک اور چیز بھی بڑی اہم ہے جب 1939ء میں صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں ختم ہوئیں تو قائدِ اعظم نے سارے ملک میں یومِ نجات کا اعلان کیا۔ یومِ نجات منائے جانے والے دن گلبرگہ کے مسلمانوں کی طرف سے گاندھی کو ایک تار موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔ ''یومِ نجات کی مبارکباد، قائدِ اعظم زندہ باد'' گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن میں جنوری 1940ء کو لکھا۔ ''جب مجھے یہ تار ملا تو میں بھی تار بھیجنے والوں کی تمنا اور خواہشات میں شامل ہو گیا۔ قائدِ اعظم زندہ باد، قائدِ اعظم ہمارے ایک پرانے ساتھی ہیں۔'' اور 16 جنوری 1940ء والے خط، جس میں گاندھی نے قائدِ اعظم لکھا تھا، کے ساتھ اپنے ہریجن والے مضمون کی کاپی بھی قائدِ اعظم کو بھیجی تھی۔ دراصل گاندھی چاہتے تھے کہ قائدِ اعظم بھی انہیں مہاتما گاندھی کے نام سے مخاطب کریں لیکن جب قائدِ اعظم نے ایسا نہیں کیا تو پھر کبھی بھی گاندھی نے خطوط میں قائدِ اعظم کو قائدِ اعظم کے نام سے مخاطب نہ کیا۔

یہ تمام حقائق مولانا آزاد کے بیان کی نفی کرتے ہیں۔ دوسری طرف ''آزادی ہند'' کے اثرات کا یہ حال ہے کہ آکسفورڈ کی مشہور خاتون پاکستانی محقق محترمہ عائشہ جلال نے ٹیلیویژن پر دعویٰ کر دیا کہ آپ کو پتا ہے قائدِ اعظم کو قائدِ اعظم کا خطاب کس نے دیا تھا۔ جب اینکر نے لاعلمی کا اظہار کیا تو فرمایا گاندھی جی نے۔ ایسی مصنفہ کی بقیہ تحقیق کا اندازہ

اس ایک بات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ویسے ''الہلال''میں بعض اوقات مولانا آزاد کے نام کے ساتھ بھی قائدِ اعظم لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد نے کانگریس کے خصوصی اجلاس میں 1923ء میں گاندھی کو بھی قائدِ اعظم کہا تھا۔

قائدِ اعظم کسی قسم کے اعزاز کو ناپسند کرتے تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے لیے کسی خطاب یا لقب کی خواہش کی۔ جس کا ایک ثبوت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاءالدین احمد اور قائدِ اعظم کے درمیان خط و کتابت ہے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین نے قائدِ اعظم کو لکھا کہ یونیورسٹی انہیں ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری دینا چاہتی ہے مگر قائدِ اعظم نے انکار کر دیا اور لکھا۔ ''میں نے زندگی صرف مسٹر جناح کی حیثیت سے بسر کی ہے اور صرف مسٹر جناح کی حیثیت سے مرنے کی آس رکھتا ہوں۔ مجھے بہت مسرت ہو گی اگر میرا نام کسی کے سابقے سے مبرا رہے۔''

یہ ہے قائدِ اعظم کا خطاب اور قائدِ اعظم کا کردار۔ اور دوسری طرف مولانا آزاد اور امام الہند کی کہانی بڑی دلچسپ بھی ہے عبرت انگریز بھی۔

یہ خطاب ایسا ہے جو کبھی مولانا آزاد کی امیدوں اور آرزؤں کا مرکز رہا تھا۔ یہ خطاب پانے کے نہ صرف مولانا آزاد خواہشمند تھے بلکہ یہ خطاب پانے کے لیے انہوں نے مہم بھی چلائی اور مریدوں کی مدد سے دوسرے علماء کو قائل کرنے کی بھی کوشش کی مگر ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''۔ نہ علمائے وقت نے مولانا آزاد کو اس خطاب سے نوازا اور نہ عامتہ

الناس نے شرفِ قبولیت بخشا۔ پھر بھی چند فیس بکیے، چند صحافی اور چند نیم ملا ایسے ہیں جو آج بھی مولانا آزاد کے نام کے ساتھ یہ خطاب لکھ کر سینکڑوں علمائے ہند کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

اس خطاب کے اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ 1919ء میں برصغیر کے علماء نے جمعیت علمائے ہند کی بنیاد رکھی جس کا پہلا سالانہ اجلاس نومبر 1919ء میں ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ''شیخ الہند'' مولانا محمود حسن مالٹا کی اسیری کے دن پورے کر کے ہندوستان تشریف لائے۔ اس وقت ان کی صحت کافی خراب تھی اور انہوں نے اپنے حلقے کے مریدوں سے کہا کہ میرا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانانِ ہند ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر انگریز سے آزادی کی جدوجہد کریں اور اس کے لیے ایک ''امام الہند'' کا انتخاب کریں۔ یہ خبر جب مولانا ابوالکلام آزاد تک پہنچی تو ان کے دل میں پہلے سے موجود خواہش نے انگڑائی لی اور وہ سمجھے کہ ان کی مراد برآئی۔ چونکہ اس سے پہلے وہ ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک تنظیم بنا چکے تھے جس کے لیے وہ اپنی بیعت بھی لیا کرتے تھے۔ اپنے لیے بیعت کا مقصد ان کے مقرر کردہ خلیفہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بقول یہی تھا کہ جب ہندوستانی مسلمان اور علماء کے سامنے آزادی کی جدوجہد میں امامت کا مسئلہ پیدا ہو گا تو ان کے لیے راہ پہلے سے ہموار ہو چکی ہو گی۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن کی طرف سے امام الہند کا تذکرہ سن کر مولانا کے خلیفہ رزاق ملیح آبادی مولانا آزاد کے لیے راستہ صاف کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے پہل وہ خود شیخ الہند

سے ملے۔ انہیں دو تین ناموں کا تذکرہ کرنے اور ان کے کردار کی کمزوریاں بیان کرنے کے بعد مولانا آزاد کی خوبیاں بیان کرنے اور مولانا محمود الحسن کو ان کی طرف مائل کرنے میں اپنے تائیں کامیاب ہو گئے۔ اگلا مرحلہ کچھ اور علماء کو بھی ہم نوا بنانے کا تھا جس کے لیے مولانا رزاق ملیح آبادی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان حالات میں جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس نومبر 1920ء میں منعقد ہوا جس میں مولانا محمود الحسن بنفسِ نفیس شریک تھے۔ اس اجلاس سے پہلے علماء کے درمیان ہونے والی خط و کتابت سے بھی عیاں ہے کہ اس اجلاس میں مسئلہ امامت زیرِ غور آنے اور کسی کو ''امام الہند'' منتخب کیے جانے کی امید تھی۔ مگر چند سرکردہ علماء جن میں علامتہ الہند معین الدین اجمیری اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا خیال تھا کہ ایسے اہم مسئلے کو جلد بازی میں نہ نمٹایا جائے۔ اگرچہ مسئلہ امامت سے مولانا آزاد کو بھی بڑی امیدیں تھیں مگر مذکورہ اجلاس میں مسئلہ امامت اور امام الہند کے انتخاب کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اس اجلاس کے دس دن بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا انتقال ہو گیا۔

تاہم مولانا آزاد اور ان کے لواحقین کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ اس سلسلے میں خط و کتابت بھی ہوتی رہی اور ملاقاتیں بھی۔ ان حالات میں جمعیت علمائے ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس اپریل 1921ء میں بریڈ ہال لاہور میں ہونا طے پایا۔ جس کی صدارت کے لیے منتظمین نے پیشگی مولانا آزاد کا نام اس امید میں طے کر دیا کہ اب ''امام الہند'' کی تجویز منظور ہو جائے گی۔ جسے امام لہند بننا ہے اسے ہی اجلاس کا صدر ہونا چاہیے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

مذکورہ اجلاس میں جب یہ تجویز زیرِ غور آئی تو پہلے خود مولانا آزاد نے اور بعد میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید نے حمایت کی۔ لیکن اس کے بعد مولانا معین الدین اجمیری نے تقریر کی اور کہا ''آیاز قدرِ خود بشناس۔ کہاں تم اور کہاں یہ رفیع وعالی منصب۔ تم ایسے نوعمر کو تو اکابر علماء کی موجودگی میں زبان کھولنا بھی مناسب نہیں۔'' ان کے بعد مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی مخالفت میں تقریریں کیں۔ جبکہ مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور علی برادران بھی مولانا آزاد کے لیے اس خطاب کے مخالف تھے۔ اس موقع پر سینکڑوں علماء موجود تھے مگر مولانا آزاد کے حق میں کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی اور یہ قصہ ہمیشہ کے لیے یہیں دفن ہو گیا۔

اوپر میں نے عبد الرزاق ملیح آبادی کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہی عبد الرزاق ملیح آبادی ہیں جنہوں نے ''آزاد کی کہانی، آزاد کی زبانی'' جیل کے دوران مولانا آزاد سے سُن کر مرتب کی تھی۔ اپنی دوسری کتاب ''ذکرِ آزاد'' مولانا آزاد کے ساتھ گزارے 38 سال کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

''مولانا آزاد نے بتایا دوسرے صوبوں میں بیعت کا کام جاری کر دیا ہے۔ یوپی کا صوبہ تم اپنے ذمہ لو۔ میں راضی ہو گیا۔ تو اپنے ہاتھ سے لکھ کر تحریر دی جس میں مجھ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور لکھا کہ میں ان کی بیعت لینے کا مجاز ہوں۔ تحریر حسبِ ذیل ہے۔

''اخویم مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے وہ بیعت لینے اور تعلیم وارشادِ سلوکِ سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون ومجاز ہیں، جو طالبِ صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے انہوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔''

آگے لکھتے ہیں۔ ''اسی زمانے میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مالٹا کی نظر بندی سے چھوٹ کر پہلی دفعہ لکھنو تشریف لائے اور فرنگی محل میں ٹھہرے۔ میں وہاں گیا اور بزمِ خویش دونوں بزرگوں یعنی مولانا عبد الباری اور حضرت مولانا محمود الحسن کو مولانا آزاد کے امام الہند بننے پر راضی کرنا چاہا مگر دونوں بات ٹال گئے۔ مولانا عبد الباری نے ایک مبہم تحریر بھی لکھ دی جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

''مولانا محمود الحسن سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب اسبق ہیں۔ان کی امامت سے مجھے استخفاف نہیں ہے۔ سر و چشم قبول کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ تفریقِ جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں۔ کسی نااہل کو بھی اگر اہلِ اسلام قبول کرلیں گے تو وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گزار و فرمانبردار مجھے پائیں گے۔ اصل یہ کہ یہ تحریک دیانتاً میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا نہ کسی کو منتخب کر کے اس کے اعمال اپنے اوپر لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں۔اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں۔''

یہ خط مولانا کو ملا انہوں نے مجھے لکھا۔ ''مولوی عبد الباری کا خط دیکھا'' یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم '' سرِ دست اس قصہ کو تہہ کیجئے اور کام کیے جایے۔ پنجاب، سندھ اور بنگال میں تنظیم مکمل ہے۔ ''

اب یہ معلوم نہ ہو سکا پنجاب، سندھ اور بنگال میں جس تنظیم کے مکمل ہونے کا مولانا آزاد دعویٰ کر رہے ہیں وہاں کتنے ہزار یا کتنے لاکھ لوگ مولانا نے مرید کر لیے تھے۔

آگے چل کر مولانا رزاق ملیح آبادی ایک اور خط مولانا آزاد کی طرف سے نقل کرتے ہیں۔

''بہر حال ہمارا دائرۂ عمل مکمل ہو چکا ہے۔ پنجاب، سندھ و بنگال متحد و متفق ہیں۔ اور اب کام تیزی سے جاری ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کے فیصلے کا انتظار بے سود تھا اور بے سود ہے۔ '' یعنی مولانا محمود الحسن، مولانا عبد الباری اور دوسرے علماء سے حمایت بے سود تھی اور بزعمِ خود مولانا آزاد خود کو اس منصب کا نہ صرف اہل پاتے تھے بلکہ ''امام الہند'' بن بیٹھے تھے۔ کیونکہ بقول ان کے پنجاب، سندھ و بنگال ان کی امامت پر متفق ہو چکے تھے۔

عبد الرزاق ملیح آبادی مزید لکھتے ہیں۔

''پھر مولانا آزاد نے تحریکِ امامت کو ختم کر دیا اور امامت کے معاملے کی اہمیت دفعتاً'' مولانا کے ذہن میں کم ہو گئی اور اس کا سبب انہوں نے کبھی نہیں بتایا۔ '' مگر بقول ملیح آبادی۔ ''لیکن مولانا محمد علی جوہر نہایت مستعد لیڈر تھے اور طوفانی طبیعت رکھتے تھے۔

ان کا اثر تیزی سے بڑھ رہا تھا اور مولانا آزاد کی امامت ہی کے نہیں خود مولانا کی ذات کے سخت مخالف تھے۔ دونوں میں عمر بھر رقابت رہی۔ قدرتی طور پر مولانا نے جواز حد معاملہ فہم اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے۔ محسوس کر لیا کہ علی برادران سے تصادم مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دے گا۔ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی انہی علی برادران کے ساتھ تھا۔ پھر فرنگی محل بھی مخالف تھا اور گو شیخ الہند کی طرف سے مخالفت نہ تھی مگر دیوبند کا طاقتور حلقہ بھی مولانا کا طرفدار نہ تھا''۔

جو بات ہم نے اوپر دوسرے حوالوں سے لکھی ہے مولانا آزاد کے خلیفۂ مجاز کی تحریر اس کی تائید کرتی ہے۔ یعنی علمائے ہند مولانا آزاد کے لیے ''امام الہند'' کے خطاب کے مخالف تھے۔ اس کے باوجود کچھ لوگ آج بھی انہیں ''امام الہند'' لکھتے اور انہیں ''امام الہند'' منوانا چاہتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ برِصغیر میں انہی کے مسلک کے سربرآوردہ علماء نے انہیں اس خطاب سے نوازنے سے یکسر انکار کر دیا تھا۔

ایک طرف قائدِ اعظم جو کسی سابقے ولاحقے کو ناپسند کرنے والے اور دوسری طرف مولانا آزاد جو ''امام الہند'' کا خطاب پانے کے متمنی و شیفتہ۔

تحریکِ خلافت وترکِ موالات اور مولانا آزاد

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب اتحادی فوجوں کو کامیابی ملی اور دوسرے ممالک کی طرح ترکی بھی شکست خوردہ ممالک میں شامل تھا تو اتحادیوں نے اس بات کا بدلہ اس طرح لیا کہ ترکوں کو ذلت آمیز شرائط قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ ان حالات میں برصغیر کے مسلمان جن کا خلافت کے ساتھ ایک روحانی تعلق تھا وہ بے چین ہوئے اور ہندوستان میں سلطنتِ عثمانیہ کے حق میں اور خلافت کی بحالی کے لیے تحریک کا آغاز کر دیا۔ خلافت سے مسلمانوں کی وابستگی ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ اس موقع پر بھی برصغیر کے مسلمانوں نے تحریکِ خلافت کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ جس کے روح رواں برِصغیر کے بہت سے علماء تھے۔ خلافت تحریک اور پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تحریک ترکِ موالات اور تحریکِ ہجرت پر دسویں کتابیں موجود ہیں جو اصحاب یہ تفصیل پڑھنا چاہیں وہ ان کتابوں سے رجوع کر سکتے ہیں۔ یہاں ہم صرف مولانا آزاد کے ان بیانات کا تجزیہ پیش کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے اس تحریک کے حوالے سے اپنی کتاب ''آزادی ہند'' میں پیش کیے۔ اگرچہ مولانا خود اس تحریک کے ہراول دستہ میں شامل رہے تھے اور نہ صرف تحریر و تقریر کے ذریعے مسلمانوں کو اس تحریک کی حمایت پر آمادہ کیا بلکہ اس جرم کی پاداش میں وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔

مولانا کے فطری اور ذہنی انقلاب نے نہ صرف اُن کے اُصولوں اور عقیدوں کو متاثر کیا اور نہ صرف اُن کے اقدار و معیار بدلے بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی حقائق و واقعات کی تفہیم بھی مختلف ہو گئی۔ ابتدائی دور میں انہوں نے بعض واقعات اور حوادث کو تاریخی حیثیت سے ایک خاص رنگ میں پیش کیا اور آخری دور میں اِن کی توجیہات اور توضیحات یکسر بدل گئیں۔ مثال کے طور پر ترکِ موالات کی تحریک کی توجیہہ اور اُس کے ارتقاء کے متعلق جو بیانات و خطبات اُس تحریک کے دوران دیے اور جو تقاریر اس زمانے میں کیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اُس تحریک کی قیادت اور اُس تحریک کے ہیرو مسلمان لیڈر تھے جن کی قیادت علی برادران، حکیم اجمل خان، مولانا عبدالباری اور خود مولانا آزاد کے ہاتھ میں تھی۔ من حیث القوم ہندو 1921ء تک اس تحریک سے بلکل علیحدہ رہے۔

البتہ گاندھی جی شروع ہی سے اس کے ساتھ اور مسلم لیڈروں کے ہم نوا و ہم خیال تھے۔ مولانا کی اپنی تقریروں اور تحریروں سے پتہ چلتاہے کہ ترکِ موالات کا پروگرام خالص اسلامی اور مسلمانوں کا سوچا ہوا اور اُنہی کا جاری کردہ تھا۔ یہاں ہم مولانا کی چند تقریروں کے حوالے پیش کرتے ہیں جس میں وہ یہی باتیں فرما چکے ہیں۔ نومبر 1921ء میں اپنے ایک خطبے میں اس مسئلے پر اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں۔

''خلافت کمیٹی نے باوجود نہایت مایوس کن اور مہیب مخالفتوں کے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور بالآخر ملک کی سب سے بڑی نائب اور سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے لیے بھی ترکِ موالات کا نصب العین نظامِ عمل بن گیا اور جو بات ابتداء میں صرف خلاف

کمیٹی کی ایک بدعت سمجھی جاتی تھی وہ اب تمام ہندوستان کے لیے ذریعۂ نجات تسلیم کر لی گئی ہے۔ ابتداء میں صرف مہاتما گاندھی خلافت کمیٹیوں کی تجویز ترکِ موالات میں شریک و معاون تھے لیکن اب تمام برادران ہنود ہمارے ہم عصر اور ہم نوا ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تمام تحریک خلافت کے لیے ہے۔ اور خلافت تحریک ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے جو نتائج اس وقت کے دامنِ تہی میں نظر آ رہے ہیں وہ فی الحقیقت دعوتِ خلافت کے ہی برگ و بار ہیں۔ اگر خلافت کمیٹی کی جدوجہد ظہور میں نہ آتی تو کیا ہندوستان کی جدوجہد کی تاریخ میں یہ عظیم الشان فتح مندی نظر آسکتی تھی کہ گنے ہوئے 90 دنوں کے اندر ایک کروڑ پانچ لاکھ روپیہ جمع ہو چکا ہے اور لاکھوں چرخے بیک وقت متحرک ہیں۔''

پھر آگرہ کی صوبائی خلافت کانفرنس کی صدارت فرماتے ہوئے 25 اکتوبر 1921ء کو ترکِ موالات سے متعلق اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

''اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو آپ ہی کا صوبہ ہے جس کی کانفرنس میں سب سے پہلے اس عملِ عظیم کا اعلان کیا گیا جس کو آپ ترکِ موالات کے نام سے سُن چکے ہیں۔ سب سے پہلے ترکِ موالات کا خلافت کمیٹی کی طرف سے بطور ایک عملِ دفاع کے اور بطورِ ایک عملِ احتجاج کے اعلان کیا تھا۔ لیکن جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ایک ملکی مسئلے سے ہے وہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے کے محرک چند رفقاء تھے میں نام لوں گا مہاتما گاندھی جی کا وہ اس تحریک کے اولین اور سب سے بڑے قابلِ عزت رفیق تھے کہ جنھوں نے اس

تحریک کا ساتھ دیا۔ خلافت کمیٹی نے احکامِ شرع کے ماتحت اس امر کا فیصلہ کیا کہ ترکِ موالات مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ ترکِ موالات کے ضمن میں قران مجید کے احکامات کیا ہیں۔؟ موالات، ولایت سے ہیں، ولایت کے معنی ہیں محبت اور اعانت و نصرت تو ترکِ موالات کے معنی ہوئے مددگاری کے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لینا جب تک وہ جماعت اپنے ظلم سے باز نہ آجائے۔ ایسے غیر مسلم لوگوں کے متعلق بلاشبہ قرآن مجید کی یہ تعلیم ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کر لینے چاہئیں اور قرآن کریم کا یہ قانون کامل انصاف اور عدالت پر ہے جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے۔ سب سے پہلے ترکِ موالات کا اعلان کلکتہ کے اُس جلسۂ خلافت میں ہوا جو فروری 1920 کو ٹاؤن ہال میں ہوا تھا اور میں اُس کا صدر تھا۔ سب سے پہلے اس کی تحریک وہاں کے خطبۂ صدارت میں کی گئی۔"

پھر تھوڑا سا آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ پہلی اپیل ہے بلکہ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے جو تیرہ سو برس سے مسلمانوں میں موجود ہے۔ اس وقت اس مسئلے کے عمل میں اگرچہ خلافت کمیٹی کے تمام اراکین شامل تھے۔ لیکن یہ واقعہ آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان کی جو سب سے بڑی جماعت تھی یعنی انڈین نیشنل کانگریس نے اس میں شرکت نہیں کی تھی اور یہ آخری میدان تھا جس کو وہ فتح کرنا چاہتی تھی۔ آگرہ کے اجلاس میں تیسری منزل بھی سامنے آئی اور تحریکِ خلافت نے نہایت کامیابی سے اس کو فتح کر لیا۔"

ان تحریروں سے جو کہ خلافت تحریک کے دور میں ہی لکھی گئیں یہ بات واضح ہے کہ ترکِ موالات خالص مسلمانوں کی اور عین اسلامی تعلیمات پر مبنی تحریک تھی جس کے بانی مسلم رہنماء تھے اور ہندو لیڈروں میں صرف گاندھی تھے جنھوں نے اس کا ساتھ دیا۔ مگر 38 سال بعد جب مولانا آزاد نے ''آزادی ہند'' لکھی تو اس میں اپنی مذکورہ بالا تقریروں اور تحریروں کے بالکل برعکس گاندھی کو اس تحریک کا لیڈر بنا ڈالا۔ مولانا ''آزادی ہند'' میں لکھتے ہیں۔

''اب سوال یہ تھا کہ اگلا قدم کیا ہو ایک میٹنگ ہوئی جس میں مسٹر محمد علی، مسٹر شوکت علی، حکیم اجمل خان اور مولوی عبد الباری فرنگی محلی بھی شریک تھے۔ گاندھی جی نے اپنا پروگرام ترکِ موالات سے متعلق پیش کیا، انہوں نے کہا کہ اب وفود اور عرضداشتوں کے دن رخصت ہو چکے ہیں ہمیں حکومت سے اپنا تعاون واپس لے لینا چاہیے۔ یہ وہ واحد طریقہ ہے جو حکومت کو ہم سے معاملہ کرنے پر مجبور کر سکے گا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ تمام سرکاری خطابات لوٹا دیئے جائیں، قانونی عدالتوں اور تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے، ہندوستانی ملازمتوں سے مستعفی ہونے اور نئی قانون ساز مجلسوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا جائے۔ جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی تجاویز بیان کیں مجھے یاد آیا یہی پروگرام تھا جس کو ٹالسٹائی نے بہت پہلے مرتب کیا تھا۔ 1901ء میں ایک انارکسٹ نے اٹلی کے بادشاہ پر حملہ کیا تھا۔ ٹالسٹائی نے اس وقت انارکسٹوں کے نام ایک کھلا خط بھیجا تھا کہ تشدد کا طریقہ اخلاقی طور پر غلط اور سیاسی طور پر تقریباً بے سود ہے۔

''اگر ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لے لے گا۔ دراصل تشدد خود تشدد کو جنم دیتا ہے۔ ایک یونانی حکایت کے مطابق قتل ہونے والے ہر سپاہی کے خون سے 999 نئے سپاہی پیدا ہوتے ہیں۔ سیاسی قتل میں ملوث ہونا عفریت کے دانتوں کی فصل اُگانا ہے۔ ٹالسٹائی نے مشورہ دیا کہ کسی جابر حکومت کو بے بس کرنے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس کی ادائیگی سے انکار کر دیا جائے۔ تمام ملازمتوں سے استعفے دے دیئے جائیں اور ایسے ادارے جو حکومت کی حمایت کرتے ہیں اُن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اُس کا خیال تھا کہ اس قسم کا پروگرام کسی بھی حکومت کو مفاہمت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دے گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے خود الھلال کے بعض مضامین میں اسی سے ملتے جلتے پروگرام کی تجویز رکھی تھی۔

''دوسرے اصحاب نے اپنے اپنے ذہنی پس منظر کے مطابق اس کا جواب دیا۔ حکیم اجمل خان نے غور کے لیے کچھ وقت مانگا اور کہا کہ جب تک وہ خود اس پروگرام کو قبول نہ کر لیں دوسروں کو مشورہ نہ دیں گے۔ مولوی عبدالباری نے مراقبہ کرنے اور غیبی ہدایت آنے کا کہا۔ محمد علی اور شوکت علی نے کہا کہ وہ مولوی عبدالباری کے فیصلے کے آنے تک انتظار کریں گے۔ اُس کے بعد گاندھی جی نے میری طرف رخ کیا۔ میں نے ایک لمحہ کی جھجک کے بغیر کہا مجھے یہ پروگرام منظور ہے۔ اگر لوگ سچ مچ ترکی کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو گاندھی کے اس پروگرام کا کوئی بدل نہیں۔ چند ہفتوں بعد میرٹھ میں ایک کانفرنس تھی وہاں سے گاندھی جی نے پہلی بار عدم تعاون کے پروگرام کی تلقین کی۔ وہ بول چکے تو میں

نے تقریر کی اور اُن کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا۔اُس کے بعد کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا جو مہاتما گاندھی کے پروگرام پر غور کے لیے منعقد ہوا۔ گاندھی نے کہا اگر سوراج حاصل کرنا ہے اور مسئلہ خلافت کا حل تلاش کرنا ہے تو ترکِ موالات کے پروگرام پر عمل لازمی ہے۔ لالہ راج پت رائے اس اجلاس کے صدر اور سر سی آر داس اس کے منتظم تھے۔اُن میں سے کسی نے بھی گاندھی سے اتفاق نہ کیا۔ بپن چندر پال نے بڑی زور دار تقریر کی اور کہا حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے بہترین ہتھیار برطانوی سامان کا بائیکاٹ ہے۔ مہاتما گاندھی کے پروگرام کے دوسرے حصوں سے اُسے اتفاق نہ تھا۔اُن کی مخالفت کے باوجود تجویز ترکِ موالات بھاری اکثریت سے منظور ہوئی۔''

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

وہ تحریک جو خالص مسلمانوں کی تحریک تھی اور مولانا کی اپنی تقریریں و تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ یہ تحریک مسلمانوں نے قرآنی احکامات کے تحت شروع کی تھی۔ مگر اب اس ساری تحریک کا کریڈٹ گاندھی کے نام منتقل کر دیا گیا۔ کہاں تو تحریک کے زمانے میں خود مولانا آزاد نے اس تحریک کو مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی دینی بنیاد بتلایا تھا اور اسے قرآن مجید کی آیتوں سے مسلمانوں پر لازم قرار دیا تھا اور کہاں یہ گاندھی کی تجویز اور ٹالسٹائی کا فلسفہ کہی جا رہی ہے۔ دراصل تحریکِ خلافت کے زمانے میں مولانا آزاد قرآنی تعلیمات کے تحت مسلم قومیت کے حامی اور پرچارک تھے۔ اس سے پہلے بھی الھلال اور البلاغ کی تحریریں ان کے مسلم قومیت کے فلسفے پر شاہد و عادل ہیں۔ ترکِ موالات کے حوالے سے

بھی وہ انہی خیالات کے تحت تقریریں کر رہے تھے۔ مگر ترکِ موالات تحریک کے خاتمے کے بعد جب انھوں نے گاندھی جی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے فلسفے متحدہ قومیت کی طرف ان کی کایا پلٹ ہوئی تو پھر ہرا سرخ اور سرخ ہرا بن گیا اور جب اپنے آخری دور میں تاریخ کے سابقہ واقعات لکھنے بیٹھے تو یہ ضروری سمجھا کہ ان واقعات کی توجیہہ بھی متحدہ قومیت کے فلسفے کے تحت بیان کی جائے۔ ''ہسٹری آف دی کانگریس'' کے مصنف نے بھی حقائق کو بدلنے کی اتنی جرات نہیں کی جیسا مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریکِ موالات کی تمام تحریک کا ہیرو گاندھی جی کو بنا ڈالا۔

اگرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات خالصتاً مسلمانوں کی بنائی ہوئیں تحریکیں تھیں اور پھر اس زمانے کی مولانا آزاد اپنی تقریریں بھی یہی ثابت کرتی ہے۔ میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں کہ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے آغاز، ارتقاء، عروج اور پھر زوال کی تاریخ اجمالاً بیان کر دوں تا کہ ہماری نوجوان نسل یہ جان سکے کہ 1919-1920ء کے ہندوستان میں مسلمان اپنے حقوق، استحکامِ خلافت اور آزادی کے لیے کیا کر رہے تھے اور مولانا آزاد کے متحدہ قومیت کے ہندو بھائی کہاں کھڑے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد جب اتحادیوں نے ذلت آمیز شرائط پر ترکوں کو مجبور کر کے ترکی کو تقسیم کر لیا تھا اور ابتدائے جنگ میں جو وعدے خلیفہ اور مسلمانانِ ہند سے کیے تھے ان سب کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ تو اس وقت مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں

خلافت کمیٹی بنائی گئی جس میں زیادہ تر افراد وہی تھے جو اس وقت مسلم لیگ کے ممبر تھے مثلاً علی برادران، حکیم اجمل خان، مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ۔ خلافت کمیٹی کا وفد وائسرائے سے ملا اور مسلمانانِ ہند کا موقف پیش کیا۔ مگر وائسرائے کا جواب مایوس کن تھا۔

اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر کی ہی سربراہی میں دوسرا وفد امرتسر لیگ کے ریزرلیوشن کی تکمیل میں یورپ بھیجا گیا۔ وہاں مولانا محمد علی نے وزراءاور ذمہ دار اصحاب بالخصوص پاپائے روم سے مل کر اور پبلک تقاریر کر کے مسلمانانِ ہند کا نقطہء نظر مسئلہ خلافت کے متعلق پیش کیا۔ لیکن حسبِ توقع کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ آخر وفد ہندوستان آگیا اور اس کا زبردست استقبال ہوا۔ مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوگیا۔ 19مارچ 1920ء کو تمام ہندوستان میں جلسے کیے گئے اور ہڑتالیں کی گئیں۔ مولانا شوکت علی نے یہ تجویز پہلے سے دے رکھی تھی کہ ’’اگر صلح کے شرائط ہمارے مذہب کے خلاف ہوئے تو مسلمانانِ ہند تختِ برطانیہ سے وفاداری کا تعلق منقطع کر لیں گے۔‘‘ مئی میں صلح کے شرائط شائع ہوئے اور خلافت تحریک میں ایک نئے جوش کا اضافہ ہو گیا۔

آخر کار خلافت کمیٹی نے جو 1919ء میں تحفظِ خلافتِ عثمانیہ کے نام سے قائم کی گئی تھی بمبئی میں مئی 1920ء میں طے کر دیا کہ اب مسلمانانِ ہند کے پاس کوئی چارہ سوائے اس کے کہ موجودہ حکومت سے ترکِ تعاون کریں، نہیں رہا۔

دوسری طرف 20 مئی 1920ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ بنارس میں ہوئی۔ یہاں لیڈروں کی ایک کانفرنس ترکِ موالات کے پروگرام پر غور کرنے کے لیے بنائی گئی جس کی میٹنگ 20 جون کو ہوئی اور کمیٹی نے تجاویز پیش کیں جس میں برٹش اشیاء کا بائیکاٹ اور عدالتوں وسکولوں کا بائیکاٹ شامل تھا۔

دوسری طرف خلافت کمیٹی یہ پروگرام پہلے سے جاری کر چکی تھی۔ کانگریس نے ابھی تک ترکِ موالات کی تجویز پاس نہیں کی تھی۔ جبکہ خلافت کمیٹی کلکتہ اور دوسری جگہوں پر تائیدی جلسے بھی کر چکی تھی۔ مدراس کانفرنس میں خلافت کمیٹی نے خطابات کا واپس کرنا، مجسٹریوں کو چھوڑنا اور ملازمتیں چھوڑنا بھی پروگرام میں شامل کر لیا تھا۔ ترکِ موالات کا باقاعدہ اعلان صرف مسلمانوں کی طرف سے یکم اگست کو ہوا اور علی برادران نے ملک کے دورے بھی شروع کر دیے۔ وہ گاندھی جی کو بھی خوشامدوں سے اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے جبکہ لالہ لاجپت رائے اور مالویہ جی پین اسلام ازم کا ہوا کھڑا کر کے گاندھی کو خطرات سے ڈرا رہے تھے۔ اس کے ساتھ تحریکِ ہجرت بھی مسلمانوں کی طرف سے شروع ہو چکی تھی۔ اور مسلمان تکالیف اٹھا کر افغانستان کی راہ لے چکے تھے۔

یہ عجیب لطف ہے کہ مسلمان ترکِ موالات پر عامل ہو چکے تھے اور لڑائی شروع کر چکے تھے۔ مگر کانگریس اور ہندو لیڈروں نے ابھی تک اسے منظور نہ کیا تھا۔ 9 دسمبر 1920ء کو کلکتہ میں کانگریس کا سپیشل اجلاس ہوا اور ترکِ موالات کی تجویز پاس ہوئی۔ لیکن

دسمبر 1920ء تک ہندوئوں نے اس پر عمل نہیں کیا کیونکہ ابھی ناگپور اجلاس میں قطعی فیصلہ ہونا باقی تھا۔ ہندو عوام اور لیڈر سخت قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ ناگپور اجلاس بھی مسلمانوں کے جوشِ عمل اور آمادگیٔ کارزار کا ثبوت بنا۔ ناگپور اجلاس کے 14582 ڈیلیگیٹ میں سے 10500 مسلم ڈیلیگیٹ تھے۔ سی آر داس 36 ہزار روپیہ خرچ کر کے 250 ہم خیال ترکِ موالات کی مخالفت میں لے آئے تھے۔ مگر مولانا محمد علی اور مسلمانانِ ہند کی وجہ سے کانگریس نے اسے منظور کر لیا۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ گاندھی اور کانگریس نے مسلمانوں کو صرف اپنا وطنی بھائی سمجھ کر تحریکِ خلافت کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ اس میں ان کے کچھ مفاد بھی پوشیدہ تھے۔ گاؤ رکشا کی تحریک ہندؤں نے صدیوں سے چلائی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے چاہتے تھے کسی طرح اس پر پابندی لگوائی جائے مگر ناکام رہے تھے۔ اب مسلمانوں سے تعاون کے بدلے انہیں ایک راستہ نظر آ رہا تھا۔ ایک بار جب گاندھی جی مسلمان لیڈروں سے ملنے جا رہے تھے تو مالویہ جی نے انہیں کہا موقع ہے مسلمانوں کو گائے کے ذبیحہ سے روکنے پر آمادہ کریں۔ گاندھی نے چالاکی سے کہا ابھی وقت نہیں، مناسب موقع پر بات کروں گا۔ آخر وہ مناسب موقع بھی آ ہی گیا۔ گاندھی نے تحریک کے عروج پر مسلم رہنماؤں سے کہا ہم نے آپ کے دینی مسئلہ میں آپ کا ساتھ دیا آپ بھی ہندو کے جذبات کو مدِ نظر رکھ کر گائے ذبیحہ کو موقوف کر دیں۔ تیر نشانے پر لگا اور مسلمان علماء نے فتویٰ

دے دیا کہ ہندو کے جذبات کالحاظ کرتے ہوئے اس سال بقرِ عید پر مسلمان گائے کی قربانی نہ کریں۔

سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

تحریک زوروں پر چل پڑی۔ جیلیں بھر گئیں۔ خطابات واپس کر دیئے گئے، وکالتیں، ملازمتیں اور سکول چھوڑ دیئے گئے۔ ہجرت جاری تھی۔ اور حکومت تنگ و پریشان تھی۔ اگرچہ اب مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی برابر کے شریک تھے مگر تحریک کا ہراول دستہ مسلمان ہی تھے اور ان کے لیڈر علی برادران کا طوطی بول رہا تھا۔ مسٹر ولنٹائل شرل نے ''اضطرابِ ہند'' میں سچ لکھا۔ ''مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری علی برادران کی گردن پر ہے جنھوں نے کانگریس میں داخل ہو کر امن پسند ہندؤں میں جرأت کے عناصر پیدا کیے اور ادھر مسلمان فوج کو بغاوت پر آمادہ کیا۔''

نومبر 1919ء کو شہزادہ ولی عہد ہندوستان وارد ہوئے تو ان کے استقبال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ والنٹئیروں نے مخالفت میں مظاہرے کیے۔ پولیس نے گولی چلائی اور 53 آدمی مارے گئے اور 400 کے قریب زخمی ہوئے۔ اس وقت حکومت نے مسلم والنٹئیروں کے متعلق جو نوٹ شائع کیا وہ ''ہسٹری آف آل انڈیا کانگریس'' کے مصنف کی زبان سنئے۔

''کانگریس کے والنٹئیر اس وقت گھریلو ملازموں کی طرح تھے جو میلوں وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ لیکن خلافت کے والنٹئیر زیادہ فوجی تھے اور وہ باقاعدہ مارچ اور ڈرل کرتے تھے اور وردیوں میں ملبوس تھے۔''

انہی دنوں جب علی گڑھ یونیورسٹی میں ولی عہد کی آمد احتجاج کیا گیا۔ مالویہ جی نے ہندو یونیورسٹی میں گاندھی کو گھسنے بھی نہ دیا اور پرنس آف ویلز کو ڈاکٹر کی آنریری ڈگری عطا کی۔ مولانا محمد علی نے اپنی مادرِ علمی پر دھاوا بولا اور یونیوسٹی انتظامیہ ترکِ ملازمت پر آمادہ نہ ہوئی تو اس نے علی گڑھ یونیورسٹی کے مقابلے میں جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی۔ مگر ہندو یونیورسٹی پر کوئی ایسا دباؤ نہ ڈالا گیا۔ تحریک اپنے عروج پر تھی۔ تمام مسلمان لیڈر جیل میں تھے۔ حکومت زچ ہو چکی تھی۔ بعید نہیں تھا کہ حکومت گھٹنے ٹیک دیتی اور ہندوستانیوں کے مطالبات مان لیے جاتے۔ مگر عین تحریک کے شباب پر 5 فروری 1922ء میں چوراچوری کے واقعے کو بہانہ بنا کر گاندھی جی نے باردولی میں 12 فروری کو ریزولیوشن پاس کر کے تحریک بند کر دی۔ جلوس، جلسے اور جیل جانے کے پروگرام ختم کر دیے۔ جب تحریک پُرجوش تھی اور آخری منزل کی طرف گامزن تھی تو اسے یوں ختم کرنا ہندوستانیوں کی قربانیوں سے غداری تھی۔ مولانا حسرت موہانی پہلے کہہ چکے تھے۔ ''یہ شخص (گاندھی) درمیان میں لے جا کر ڈبوئے گا۔''

جیل میں علی برادران یہ سن کر سکتے میں آ گئے۔ بقول مولانا شوکت علی ''دنیا تاریک نظر آنے لگی ''جیل شیدائیانِ آزادی نے خطوط لکھے۔ جب 24 فروری کو ڈاکٹر انصاری کے ہاں اجلاس میں جب یہ خطوط پڑھے گئے تو گاندھی نے جواب دیا۔

''جو لوگ جیل جا چکے وہ سول حیثیت سے مردہ ہیں اور باہر والوں کو مشورہ دینے کا ان کو کوئی حق نہیں ہے۔'' حکومت نے سکھ کا سانس لیا۔ مسلمان مایوس ہو گئے۔ اگر دیکھا جائے تو اس وقت مسلم قیادت نے دو بڑی غلطیاں کیں۔ ایک تو مسلم لیگ کے ہوتے ہوئے جب کہ قیادت بھی ان کے ہاتھ میں تھی انہوں نے آل انڈیا خلافت بنا کر خود کو تقسیم کر لیا۔ پھر کانگریس میں بھی یہی اصحاب تھے۔ اگر وہ لیگ کے پلیٹ فارم سے ہی یہ تحریک چلاتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ دوسرا انہوں نے گاندھی پر بھروسہ کیا۔ چورا چوری کے واقعہ سے کانگریس کا مخالف دھڑا گاندھی کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ مسلمان ترکی اور افغانستان کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔ گاندھی جی ڈر گئے اور تحریک ختم کر دی۔ شومیٔ قسمت ترکِ موالات کے تمام فرائض خلافت کمیٹی کے تھے مولانا آزاد نے ہی انہیں کانگریس کمیٹیوں کے حوالے کیا۔ جب اس حوالے سے ان پر تنقید ہوئی تو انہوں نے فرمایا۔ ''بعض لوگوں کا خیال ہے ترکِ موالات کا عملی کام جو خلافت کمیٹی کی ذمہ داری تھی وہ تمام کانگریس کے پاس چلے جانے سے اب خلافت کمیٹی کیا کرے گی۔ میں کہتا ہوں داخلی جدوجہد کا کام کانگریس نے سنبھال لیا ہے۔ اب بیرونی کام یعنی ''سمرنا فنڈ کا اجراء'' ان کے ذمہ ہے۔''

یہ ہے منصف رہبر کا فیصلہ۔ جو انجام ہونا تھا ہوا۔ تمام قربانیاں کانگریس کے نام اور جب موقع آیا کانگریس نے اصل چہرہ دکھلایا۔ کیا عجب یہ تحریک اس طرح ختم نہ کی جاتی تو آزادی تو شاید نہیں مگر حقِ حکمرانی کے مطالبات جو 1935ء کے ایکٹ کے تحت ملے وہ 1922-23ء میں مل گئے ہوتے۔ مگر اصل حیرت مولانا آزاد کے تضادات کی کہ حضرت یوں بھی تھے اور یوں بھی۔ تحریک کے زمانے میں کچھ اور فرماتے رہے اور مسلمانوں کو قرآن کی آیتیں سنا سنا کر تحریک اور تحریک کے پروگرام پر عمل پیرا کرایا مگر بعد میں جب گاندھی کے معتقد ہوئے تو پتہ چلا کہ اصل پروگرام قرآن سے ماخوذ نہ تھا بلکہ یہ ٹالسٹائی کا فلسفہ اور گاندھی کا عملی اقدام تھا۔ اب اس کی کیا توجیہہ کی جائے کہ وہ قرآنی دلائل فریبِ محض تھا، دھوکہ تھا۔

کابینہ مشن اور مولانا ابوالکلام آزاد

کابینہ مشن برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو متحد رکھنے کی آخری کوشش تھی۔اس سے پہلے کرپس مشن ہندو مسلم تصفیہ کرانے میں ناکام ہو چکا تھا۔اس وقت ہندو اور انگریز یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ مسلم لیگ کی عوام میں وہ حیثیت نہیں جس کا دعویٰ قائدِ اعظم کر رہے ہیں۔انگریز وائسرائے اور برطانیہ گورنمنٹ بھی یہی سمجھتی تھی کہ کانگریس ہی ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ مگر دسمبر 1945ء کے مرکزی اور 1946ء کے ابتداء میں صوبائی انتخابات کے نتائج نے دونوں کی امیدیں اور اندازے غلط ثابت کر دیے۔ مسلم لیگ نے قائدِ اعظم کی قیادت میں مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستیں جیت کر دکھلا دیا کہ صرف وہی ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ دوسری طرف جنگِ عظیم دوئم کے خاتمے کے بعد برطانیہ اس پوزیشن میں نہیں رہا تھا کہ زیادہ دیر تک ہندوستان پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکے۔ لہٰذا برطانیہ نہیں چاہتا تھا کہ جلد از جلد ہندوستان سے اپنا بوریا گول کرے مگر اس طرح کہ ہندوستان کی متحدہ حیثیت برقرار رہے۔

17 فروری 1946 کو برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ پر گفت و شنید کرنے کے لیے ایک کابینہ وفد کا تقرر کیا جائے گا۔ یہ وفد جو کابینہ مشن کہلایا 23 مارچ 1946ء کو ہندوستان پہنچا جس میں وزیرِ نہر پیتھک لارنس، وزیرِ تجارت سٹیفورڈ کرپس اور وزیرِ بحریہ اے ای الیگزینڈر شامل تھے۔ یہ وفد بھیجنے سے پہلے برطانوی حکومت نے اپنی کابینہ، ارکانِ پارلیمنٹ، حزبِ مخالف کے ارکان، محکمۂ دفاع، ہندوستان

کے وائسرائے اور صوبوں کے گورنرز سے طویل صلاح مشورے کیے۔ پھر انہی کی بنیادوں پر ارکانِ وفد کے لیے سفارشات تیار کی گئیں۔ جن کا لبِ لباب یہی تھا کہ جہاں تک ہو سکے ہندوستان کو متحد رکھا جائے۔ قائدِ اعظم کو تقسیم کی صورت میں حاصل ہونے والے پاکستان کی معاشی، اقتصادی اور دفاعی مشکلات سے ڈرا کر اسے مطالبۂ پاکستان سے باز رکھا جائے۔ یہاں ان لوگوں کے لیے بھی سوچنے کا مقام ہے جو برِ صغیر کی تقسیم کو انگریز کی سازش سمجھتے ہیں، اگر ان کے دلوں پر مہر نہیں لگی تو تقسیمِ برِ صغیر سے متعلق برطانیہ کی طرف سے شائع کردہ ''انتقالِ اقتدار پیپرز'' کا صفحہ صفحہ اس بات پر گواہ ہے کہ انگریز اپنے سامراجی مفادات کے تحت ہندوستان کو متحد رکھ کر ہی جانا چاہتا تھا مگر ہندو کی تنگ نظری اور تعصب نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اس کے باوجود بھی 70 سال بعد کچھ کوتاہ بیں ایسا سمجھتے ہیں تو پھر ایسے اندھے، بہرے اور گونگے لوگوں کا کوئی علاج نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''آزادیٔ ہند'' میں کابینہ مشن پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ مگر اس طرح کہ تاریخ کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ مولانا آزاد نے کابینہ مشن پلان کی ناکامی کا ذمہ دار نہرو کو ٹھہرا کر ایک ایسی غلط فہمی کی بنیاد رکھی جس پر یار لوگوں نے پر شکوہ عمارتیں تک کھڑی کر ڈالیں۔ آج بھی پاک و ہند کی تاریخ پر تحقیق کرنے والے مؤرخین سے پوچھ لیں وہ ہندوستان کی تقسیم کا بنیادی کردار نہرو ہی کو قرار دیں گے۔ حالانکہ یہ صرف نہرو کی جذباتیت نہ تھی بلکہ گاندھی سمیت کانگریس کی ساری قیادت کا منافقانہ، تعصبانہ اور غیر ذمہ دارانہ کردار تھا جس نے مسلمانانِ ہند کی واضح اکثریت کو علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ مولانا

آزاد کے کابینہ مشن سے متعلق بیانات بھی اسی طرح تضادات کا نمونہ ہیں جس قسم کے تضادات ہم سابقہ مضامین میں دکھلا چکے ہیں۔ مولانا کے کابینہ مشن کے سامنے دیئے گئے بیانات، ارکانِ کابینہ ووائسرائے ویول کو لکھے گئے خطوط اور کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں کی گئی تقاریر ان کی ''آزادیٔ ہند'' کی تحریر کی نفی کرتی ہیں۔ مولانا کابینہ مشن کے دوران جو کچھ کہتے اور کرتے رہے ہیں وہ ان کے ''آزادیٔ ہند'' کے فرمان کے بالکل الٹ ہے۔ معلوم نہیں مولانا نے کابینہ مشن کے گیارہ بارہ سال بعد ایسے متضاد بیانات کیوں لکھ دیئے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انہیں یاد نہ رہا ہو۔ ان کے حافظے کی تو مثالیں دی جاتی ہیں۔ شاید انہیں یقین تھا کہ پسِ پردہ ان کی کی گئی باتیں کبھی پردے پر نہیں آئیں گی حالانکہ کابینہ مشن سے متعلق تمام شریک رہنماؤں کی خط وکتابت 1946ء میں ہی چھپ کر عام ہو چکی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم مولانا آزاد کے ''آزادیٔ ہند'' کے بیانات پر تبصرہ کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کابینہ مشن اور کابینہ مشن پلان کا خلاصہ پیش کر دیں تاکہ بات سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی رہے۔

کابینہ وفد جب ہندوستان پہنچا تو اس سے پہلے برطانیہ میں حکومت و حزبِ اختلاف کے مرضی سے وفد کے لیے کچھ تجاویز ہمراہ کر دی گئی تھیں جن کی روشنی میں ارکانِ وفد نے یہاں کی سیاسی پارٹیوں سے گفت وشنید کرنی تھی۔ مگر یہاں پہنچ کر ارکانِ وفد نے یہی تاثر دیا کہ وہ کوئی تجاویز پیش نہیں کریں گے بلکہ تمام پارٹیوں کے راہنماء مل کر کوئی متفقہ

فارمولہ تیار کرلیں گے۔ وفد نے باری باری تمام پارٹیوں کے سربرآوردہ راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اوران سے مختلف تجاویز پر تبادلۂ خیال کیا۔ان راہنماؤں کی تجاویز کی بنیاد پر وفد نے آئندہ دستور کاایک خاکہ یوں پیش کیا۔

ایک یونین گورنمنٹ ہو جس کے پاس خارجہ، دفاع اور مواصلات کے تین شعبے ہوں۔ اس کے نیچے مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے دو وفاق ہوں۔ ان دو وفاق میں موجود صوبے جو اختیارات چاہیں اپنے وفاق کو تفویض کر دیں۔ اور دیسی ریاستیں چاہیں تو اپنا وفاق بناکر یونین گورنمنٹ میں حصہ دار بن جائیں۔اس کے علاوہ ایک ایگزیکٹو ہو جو یونین کے امور کی دیکھ بھال کرے۔یونین گورنمنٹ اور ایگزیکٹو میں برابری کی بنیاد پر ہندو مسلم ارکان لیے جائیں۔اس خاکے کی بنیاد پر لیگ اور کانگریس کے چار چار نمائندوں پر مشتمل شملہ کانفرنس بلائی گئی مگر وہ بجوہ ناکامی سے دوچار ہوئی۔

شملہ میں ناکامی کے بعد کابینہ مشن نے اعلان کیا کہ ابھی مشن کا کام مکمل نہیں ہوا۔ مشن چندروز میں ایک بیان شائع کرے گا جس میں اگلے اقدام سے متعلق آراہوں گی۔ مشن کا یہ بیان 16 مئی کو شائع ہوااور یہی بیان برطانیہ میں وزیراعظم ایٹلی نے اسی دن اسمبلی میں بھی پیش کیا۔اسی بیان کو ''کابینہ مشن پلان'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس پلان کے اہم نکات یہ تھے۔

1 -کل ہند کا ایک یونین یا مرکز ہو جس میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستیں شریک ہوں۔ جن کے پاس خارجہ، دفاع اور مواصلات کے شعبے ہوں۔

2 -مرکز کی ایک مجلس قانون ساز اور ایک ایگزیکٹو ہو جس کے نمائندے برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں سے ان کی اسمبلیاں منتخب کر سکیں گی۔ فرقوں سے متعلق کوئی مسئلہ اس فرقہ کی حاضر اکثریت کی بنیاد پر طے ہو گا۔

3 -مرکز کے علاوہ باقی تمام شعبے اور اختیارات صوبوں کے پاس ہوں گے۔

4 -تمام صوبے مل کر اپنا اپنا گروپ تشکیل دیں گے جس کی اپنی قانون ساز اسمبلی اور ایگزیکٹو ہو گی۔ ہر گروپ صوبائی شعبہ جات میں سے ان شعبوں کا تعین کر سکیں گے جو ان میں مشترک ہوں گے۔

5 -صوبوں کے گروپ اس طرح تھے۔

الف) مدراس، بمبئی، یوپی، سی پی، بہار اور اڑیسہ

ب) پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان

(ج) بنگال اور آسام (یعنی دو مسلم اکثریتی اور ایک ہندو اکثریتی

6 -مرکزاور گروپ کے دستور میں یہ شق ہو گی کہ ابتدائی دس سال بعد اور پھر ہر دس سال بعد کوئی بھی صوبہ اپنی اسمبلی کی کثرتِ رائے سے آئین میں نظر ثانی کا مطالبہ کر سکے گا۔

7 -ہر صوبے کے لیے اس کی دس لاکھ آبادی کے برابر مرکز میں ایک نشست ہو گی۔ ہر صوبے کی کل نشستیں فرقوں میں ان کی آبادی کی بنیاد پر تقسیم ہوں گی اور ہر فرقہ کی مخصوص نشستیں اس صوبے کی اسمبلی میں موجود اس فرقے کے ارکان کے ووٹ سے منتخب کی جائیں گی۔

8 -نئے مرکزی اور گروپ کے آئین بن جانے کے بعد ہر صوبے کو اپنے گروپ سے نکلنے کا اختیار ہو گا۔ یہ اختیار نیا آئین بن جانے کے بعد نئے انتخابات سے منتخب اسمبلی ہی استعمال کر سکے گی۔

جونہی کابینہ مشن پلان سامنے آیا تمام ہندو پریس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نہرو کے اخبار ''نیشنل ہیرلڈ'' نے لکھا۔ ''جناح نے جس پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اسے کابینہ مشن پلان میں سرکاری طور پر دفن کر دیا گیا ہے۔ مشن نے جناح کے پاکستان کو جو موت کی سزا دی ہے برطانوی حکومت نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے اور اس کے زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا۔'' دوسری طرف قائدِ اعظم نے اس پر مثبت ردِ عمل کا مظاہرہ کیا اور بعد میں 3 جون کو مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے اور 6 جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے

قرارداد کے ذریعے کابینہ مشن پلان کو منظور کر لیااور کسی توضیح کے بغیر۔ مگر شادیانے بجانے والی جماعت نے پلان کی مختلف توضیحات اور تشریحات شروع کر دیں اور بہت دیر بعد اسے منظور بھی کیا تو شرائط کے ساتھ۔۔

مولانا آزاد نے کابینہ مشن کے ہندوستان آمد، مشن پلان کے جانے اوراس کے ناکام ہونے کا احوال ''آزادیٔ ہند'' میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔اپنی پوری کتاب میں قائدِ اعظم کی ہر جگہ مخالفت کے باوجود انہوں نے کابینہ مشن پلان کے حوالے سے قائدِ اعظم کے نقطۂ نظر کو درست قرار دیا ہے۔ خود مولانا آزاد بھی اس پلان کے نہ صرف حامی تھے بلکہ وہ تو خود کو اس پلان کا تجویز کنندہ بھی قرار دیتے ہیں۔ مگر جس وقت کابینہ وفد ہندوستان میں موجود تھا اس وقت مولانا آزاد کا کردار تضادات کا شاہکار نظر آتا ہے۔ بذاتِ خود وہ پلان کے اور پلان کے تجاویز کے حامی تھے مگر بحیثیت صدر کانگریس اور کانگریس ورکنگ کمیٹی میں وہ ہندو لیڈروں کی ہی زبان بولتے نظر آتے ہیں۔ کابینہ وفد کی آمد بلکہ الیکشن سے بھی پہلے کا ایک واقعہ یہاں درج کرنا ضروری ہے اس کے بعد ''آزادی ہند'' کے بیانات پر تبصرہ کرتے ہیں۔

اگست 1946ء میں مولانا آزاد نے بطور صدر کانگریس نہیں بلکہ ذاتی حیثیت سے گاندھی کو ایک یادداشت پیش کی جس میں انہوں نے فرمایا ''فرقہ وارانہ مسئلہ کو تسلیم کرنا چاہئے۔ حقیقت میں مسلمان خائف ہیں اوران کے خدشات کو دور کرنا ضروری ہے۔اس کے لیے میں تجویز کرتا ہوں کہ مستقبل کے ہندوستان کا آئین وفاقی ہو اور باقی صوبے خود مختار

ہوں۔ وفاق کے پاس صرف چند شعبے ہوں۔ صوبوں کو علیحدگی کا اختیار ہو۔ مرکزی اسمبلی اور ایگزیکٹو میں ہندؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو۔ ایک ایسی روایت ہو کہ وفاق کا صدر باری باری ہندؤں اور مسلمانوں سے لیا جائے۔ اور یادداشت میں یہ بھی کہا گیا کہ ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے مضبوط مرکز ضروری نہیں۔'' یاد رہے مولانا نے یہ یادداشت ذاتی حیثیت سے پیش کی تھی جسے نہ گاندھی نے اہمیت دی اور نہ کانگریس نے۔ مگر 14 ستمبر کو ٹائمز آف انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے بطور صدرِ کانگریس انہوں نے فرمایا۔ ''ہم صوبوں کے حقِ ارادیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر علیحدگی کی مذمت کرتے ہیں۔''

پھر 22 ستمبر کو بمبئی میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے بطور صدرِ کانگریس فرمایا۔ ''کانگریس کے پاس ایک مثبت منصوبہ ہے جس کے مطابق وہ متحدہ ہندوستان میں وفاقی حکومت کی حامی ہے۔ اس کے صوبے خود مختار ہوں مگر بچے کھچے اختیارات کے مالک ہوں۔'' یعنی بحیثیت ایک مسلمان کے مولانا آزاد مسلمانوں کے کچھ حقوق کے حامی تھے مگر کانگریس کے پلیٹ فارم سے انہیں مسلمانوں کا کیس پیش کرنے کی اجازت یا جراًت نہ تھی۔

اب آتے ہیں ''آزادیٔ ہند'' میں دیئے گئے مولانا آزاد کے بیانات کی طرف۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ''کابینہ مشن 23 مارچ کو دہلی پہنچا۔ میں 2 اپریل کو دہلی پہنچا۔ مجھے اس مرحلے پر لگا کہ اس اہم بات برطانیہ اور ہندوستان کے مابین مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ فرقہ وارانہ صورتِ حال ہے۔ شملہ کانفرنس نے مجھے باور کرا دیا تھا کہ فرقہ وارانہ اختلاف حل

طلب ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے۔ ہندوستان میں ان کی حیثیت بہر حال اقلیت کی تھی اور انہیں ڈر تھا کہ آزاد ہندوستان میں ان کا رتبہ محفوظ نہیں رہے گا۔

''میں اس مسئلے پر سوچتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان کا آئین وفاقی ہو۔ صوبوں کو زیادہ امور میں خودمختاری دی جائے۔ میرے نزدیک یہ بات صاف تھی کہ دفاع، مواصلات اور خارجہ امور وفاق کے پاس ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ صوبے کوئی اور امور اپنی طرف سے مرکز کو دینا چاہیں تو اور بات ہے۔ مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ ہندوستانی مسئلہ کسی اور طریقے سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ فرقہ وارانہ مصلحتوں سے قطع نظر ہندوستان جیسے ملک کے لیے یہ بہترین سیاسی حل تھا۔ کابینہ مشن کے افراد سے بھی میں نے یہی باتیں کیں اور وہ میرے نقطۂ نظر سے مطمئن نظر دکھائی دیئے۔ 12 اپریل کو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں بھی میں نے یہی دہرایا۔

''واقعہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ کہتے ہوئے مجھے مبارکباد دی کہ میں نے ایک ایسے مسئلے کا حل دریافت کر لیا ہے جس نے ہر ایک کو اس وقت چکرا رکھا تھا۔ انہوں نے کہا میرا حل متعصب ترین مسلم لیگی کے بھی وسوسوں کو دور کر دے گا۔ سردار پٹیل نے پوچھا کیا مرکز کے پاس صرف یہی تین شعبے رہیں گے۔ بعض اور امور مثلاً کرنسی اور مالیات بھی مرکز کے دائرے میں ہونے چاہئیں۔ اس کا جواب بھی گاندھی نے دیا اور کہا صوبے شاید انکار نہ کریں لہٰذا یہ اصرار ضروری نہیں۔

''کابینہ مشن نے اپنا پلان 16 مئی شائع کیا۔ بنیادی طور پر ویسا ہی تھی جیسا خاکہ میں نے 15 اپریل کو پیش کیا تھا۔ سوائے ایک عنصر کے اضافے کے کہ کل ہند کے تین گروپ بنا دیے گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں اس تجویز کو قبول کر لینا چاہئے۔

''پہلے پہل مسٹر جناح اس سکیم کے خلاف تھے۔ مسلم لیگ کونسل تین روز تک اجلاس کرتی رہی۔ آخری دن مسٹر جناح کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اقلیتی مسئلے کا حل اس سے بہتر نہیں ہو سکتا اور وہ اس سے بہتر شرطین نہیں منوا سکتے۔ آخر کونسل نے اسے اتفاق سے منظور کر لیا۔

''کانگریس ورکنگ کمیٹی میں انہی بحثوں کے دوران میں نے اس امر کی نشاندھی کی کہ کابینہ مشن پلان اساسی طور پر میری سکیم کے مطابق تھا۔ اس طرح ورکنگ کمیٹی کو پلان قبول کرنے میں وقت نہیں ہوئی۔''

''ہندوستان کی تاریخ میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے کابینہ مشن پلان قبول کر لیا جانا ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس کا مطلب تھا ہندوستان کی آزادی کا مشکل مسئلہ مذاکرات اور مصالحت سے طے کر دیا گیا تھا۔ ہم خوش تھے مگر نہیں جانتے تھے یہی خوشی قبل از وقت تھی۔

''مسلم لیگ کونسل نے کابینہ مشن پلان قبول کر لیا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی یہی کیا تھا۔ تاہم آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی منظوری درکار تھی۔ چنانچہ 7 جولائی کو اس کی

میٹنگ بمبئی میں طلب کی گئی۔ اے آئی سی سی کی میٹنگ میں کانگریس کے بائیں بازو نے شدید مخالفت کی اور سوشلسٹوں نے بھی اس مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جواب میں میں نے کہا کہ پلان دراصل کانگریس کی عظیم فتح تھی۔ یہ ایک پر امن حل تھا۔ میں نے مزید کہا کابینہ مشن پلان نے کانگریس کا نقطۂ نظر قبول کر لیا تھا۔ سامعین پر میری تقریر کا فیصلہ کن اثر ہوا۔ جب ووٹ لیے گئے تو قرارداد زبردست اکثریت سے منظور کر لی گئی۔ اس طرح اے آئی سی سی نے ورکنگ کمیٹی کی قرارداد پر مہرِ قبولیت ثبت کر دی۔

''اب تاریخ کا رخ بدل دینے والے بدنصیب واقعات میں سے ایک واقع پیش آیا۔ 10 جولائی کو جواہر لال نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں انہوں نے ایک حیران کن بیان دیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کانگریس نے پلان بشمول عبوری حکومت من و عن قبول کر لیا ہے۔ جواب میں انہوں نے کہا کانگریس دستور ساز اسمبلی میں یوں داخل ہو گی کہ وہ سمجھوتوں سے یکسر آزاد ہو گی اور پیش آمدہ تمام حالات کا سامنا اپنی مرضی سے کرے گی۔ دوسرے سوال کے جواب میں جواہر لال نے کہا کانگریس صرف آئین ساز اسمبلی میں شمولیت کے لیے راضی ہوئی تھی۔ وہ اس کے لیے آزاد ہے کہ پیش آمدہ حالات میں کابینہ مشن پلان میں تبدیلی یا ترمیم کر سکے۔

،،مسلم لیگ نے دباؤ میں آکر کابینہ مشن قبول کیا تھا۔ ظاہر ہے مسٹر جناح اس سے بہت خوش نہیں تھے۔ ایک کونسل میں انہوں نے کہا تھا اس سے بہتر کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ سو مسٹر جناح کابینہ مشن سے گفت و شنید کے نتائج سے بالکل خوش نہیں تھے۔ جواہر لال کا

بیان ان کے سر پر بم کی طرح گرا۔ انہوں نے فوراً بیان دیا کہ صدر کانگریس کا اعلان پوری صورتِ حال پر نظرثانی کا متقاضی ہے اور لیاقت علی خان سے کہا کہ وہ لیگ کونسل کی میٹنگ طلب کریں۔

''لیگ کونسل کا اجلاس 27 جولائی کو بمبئی میں ہوا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں مسٹر جناح نے پاکستان کا مطالبہ دہرایا اور کہا مسلم لیگ کے پاس اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ تین روز کی بحث کے بعد کونسل نے کابینہ مشن پلان مسترد کر دیا۔''

یہ ہے مولانا آزاد کا وہ بیان جو انہوں نے کابینہ مشن پلان کے ناکام ہونے کے 12 سال بعد ''آزادیِ ہند'' میں درج کیا۔ اس سارے بیان سے یہ بات تو پوری طرح عیاں ہے کہ مولانا آزاد ذاتی طور پر اس پلان کے حق میں تھے۔ وہ اسے فرقہ وارانہ مسئلے کا بہترین حل گردانتے تھے۔ مگر اس میں دو باتیں ایسی ہیں جو تاریخی طور پر غلط ہیں۔ پہلی یہ کہ قائدِ اعظم اور مسلم لیگ نے کسی دباؤ یا مجبوری میں یہ پلان منظور کیا تھا اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے۔ پلان کے شائع ہونے کے فوراً بعد اگرچہ ہندو پریس ان کا مضحکہ اڑا رہا تھا اور ان پر طنز کر رہا تھا کہ برطانیہ نے پاکستان کا مطالبہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔

قائدِ اعظم کا پہلا ردِ عمل ہی مثبت تھا۔ اور پھر 6 جون مسلم لیگ کی کونسل نے بغیر کسی توضیح کے اسے منظور کر لیا تھا۔ دراصل قائدِ اعظم ہمیشہ سے فرقہ وارانہ مسئلے کو گفت و شنید سے حل کرنے کے متمنی تھے۔ وہ متحدہ ہندوستان میں رہنے کو تیار تھے بشرطیکہ کانگریس

مسلمانوں کے حقوق کی قانونی یقین دہانی کرا دے۔ کابینہ مشن پلان نہ صرف یہ ضمانت دیتا تھا بلکہ اس میں یہ بھی تھا کہ دس سال بعد اگر کوئی صوبہ یا گروپ علیحدہ ہونا چاہے تو اسے اختیار تھا۔ قائدِ اعظم یہ تجربہ کرنے کو تیار تھے۔ اگر اکثریت کا رویہ مثبت رہتا تو مسلمان آگے بھی اسی انتظام کو اختیار کیے رہتے۔ اگر نہیں تو دس سال بعد تو پاکستان بن ہی جانا تھا بلکہ ایک نہیں دو پاکستان۔ جیسا کہا گیا تھا کہ پلان میں پاکستان کے جراثیم موجود ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی ذبردستی یا مجبوری نہ تھی بلکہ قائدِ اعظم اور لیگ کا ہمیشہ کی طرح کا مصالحانہ رویہ تھا جبکہ کانگریس نے کبھی مصالحت کا رویہ اپنایا ہی نہیں تھا۔

دوسری بات یہ کہ بقول مولانا آزاد یہ نہرو کا بیان تھا جس نے پلان کو سبوتاژ کر دیا وہ نہ صرف تاریخ کے ساتھ مذاق ہے بلکہ حقائق کا منہ چڑانا ہے۔ کانگریس نے 16 مئی کو پلان کے شائع ہونے سے لے کر 7 جولائی کو مجلسِ عاملہ کی منظور کی ہوئی قرارداد کی توثیق تک، کبھی بھی پلان کو اس کی سپرٹ کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا۔ کانگریس کی قراردادیں، کانگریسی لیڈروں کے بیانات یہاں تک کہ خود مولانا آزاد کے خطوط اور کانگریس کمیٹی میں ان کے بیانات ہمیشہ اگر مگر اور توضیحات سے پُر ہوتے تھے۔ ہو سکتا ہے ''آزادئِ ہند'' میں ان کے بیان کردہ موقف کے مطابق مولانا آزاد ذاتی طور پر کابینہ مشن پلان کے حق میں ہوں مگر جب وہ بطور صدرِ کانگریس بولتے تھے تو انہی تشریحات کا سہارا لیتے تھے جو عموماً دوسرے کانگریسی لیڈر اختیار کرتے تھے۔ کابینہ مشن پلان کی سپرٹ صوبوں کی گروپنگ اور مرکز کے پاس صرف تین شعبوں یعنی خارجہ، دفاع اور مواصلات میں پنہاں تھی جبکہ

تمام کانگریسی لیڈروں بشمول مولانا آزاد کی تقریریں اور بیانات انہی امور کی من مانی توجیہات پر مشتمل ہوتے تھے۔ اگرچہ "آزادی ہند" میں مولانا آزاد نے خود تسلیم کیا کہ اس سلسلے میں قائدِ اعظم کی توضیح درست تھی۔

انہوں نے فرمایا۔ "سب سے بڑا اختلاف کابینہ مشن پلان کی ان دفعات کی تعبیر سے متعلق تھا جن میں گروپنگ سکیم دی گئی تھی۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ قانون ساز اسمبلی کو پلان کا ڈھانچہ بدلنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ گروپنگ پلان کا لازمی حصہ تھی اور اس سلسلے میں کوئی تبدیلی سمجھوتے کی بنیاد کو بدل کر رکھ دے گی۔ خود پلان میں یہ بات موجود تھی کہ تمام گروپ جب آئین بنالیں گے، اس کے بعد کوئی صوبہ چاہے تو اپنے گروپ سے الگ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس آسام کے کانگریسی لیڈروں کا خیال تھا کہ کوئی صوبہ شروع ہی سے الگ رہ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ صوبے پہلے گروپ میں شامل ہوں، پھر وہ چاہیں تو الگ ہو سکتے ہیں۔ آسام کے کانگریسی لیڈروں کے مطابق یہ صوبے اپنی شروعات علیحدہ کر سکتے تھے پھر وہ چاہتے تو گروپ میں شامل ہو سکتے تھے۔ کابینہ مشن کا کہنا تھا اس نقطے پر لیگ کی تعبیر درست تھی۔ آسام کے کانگریسی لیڈروں کو اس سے اتفاق نہیں تھا اور گاندھی جی نے بھی آسام کے لیڈروں کی حمایت شروع کر دی۔ دیانت داری کا تقاضا یہ تھا کہ میں تسلیم کر لوں کہ اس نقطے پر مسٹر جناح کا موقف درست تھا۔ انصاف اور مصلحت، دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ کانگریسی کو کسی پس و پیش کے بغیر پلان منظور کر لینا چاہئے تھا۔"

افسوس یہی مصلحت اور انصاف ہی تو نہیں تھا کانگریس میں۔ اگرچہ مولانا آزاد کی دیانت دارانہ رائے تھی کہ مسٹر جناح کا موقف درست تھا مگر 16 مئی کو کابینہ مشن پلان کے شائع ہونے سے لے کر مسلم لیگ کے 27 جولائی کو اسے نامنظور کرنے تک کانگریس اور کانگریسی لیڈروں بشمول مولانا آزاد نے ہمیشہ اس کی من مانی توضیح کی اور اسے اپنے معنیٰ پہنائے۔ ذیل میں میں تاریخ وار کانگریسی لیڈروں، کانگریسی کمیٹی کی قراردادوں اور خود مولانا آزاد کے بیانات اور خطوط کے اقتباس درج کر رہا ہوں جس سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ کانگریس نے کبھی بھی کابینہ مشن پلان من و عن قبول نہیں کیا تھا۔

1. 3 اپریل کو مولانا آزاد نے ارکانِ وفد اور وائسرائے سے ملاقات کی۔ وہاں اپنی تجاویز پیش کرنے کے بعد کہا یہ تو بحیثیت صدرِ کانگریس، کانگریس کا موقف تھا۔ اب میں اپنی ذاتی حیثیت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی مولانا کو بحیثیت صدرِ کانگریس مسلمانوں کا کیس پیش کرنے کی آزادی نہ تھی۔

2. کابینہ مشن نے کانگریس، مسلم لیگ، سکھوں، اچھوتوں اور بعض لبرل راہنمائوں سے ملاقاتوں کے بعد 8 اپریل کو ایک مسودہ مرتب کیا جس میں دو حل تجویز کیے گئے تھے۔ حل (الف) کے مطابق یونین گورنمنٹ ہو گی جس کے نیچے تین حصے ہونے چاہئیں۔ ایک ہندو اکثریت کا، ایک مسلم اکثریت کا اور تیسرا ریاستوں کا۔ یونین گورنمنٹ کے پاس دفاع، خارجہ اور مواصلات کے شعبے ہوں۔ یونین گورنمنٹ میں تینوں حصوں کے برابر نمائندے رکھے گئے۔ ہر گروپ کے نمائندے اپنے اپنے گروپ کا آئین بنائیں۔ پھر

مل کر گرینڈ اسمبلی کا آئین بنائیں اور اگر گرینڈ اسمبلی کو گروپس کی اسمبلیوں کے فیصلے میں مداخلت کا اختیار نہ ہو۔ حل (ب) میں بتایا گیا کہ برطانوی ہند کو ہندوستان اور پاکستان میں اس طرح تقسیم کیا جائے صرف مسلم اکثریت کے اضلاع پاکستان کو دیئے جائیں۔ پنجاب اور بنگال تقسیم ہوں اور آسام سے صرف ضلع سہلٹ پاکستان کو دیا جائے۔ ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ ایسا پاکستان دفاعی، معاشی اور اقتصادی لحاظ سے ناقابلِ عمل ہو گا۔ لہٰذا عملاً کانگریس اور مسلم لیگ کو حل (الف) پر ہی گفتگو کے لیے لانا تھا۔ دونوں قیادتوں سے وفد نے رابطے کیے اور 25 دسمبر کی ملاقات میں قائدِ اعظم حل (الف) کے لیے کانگریس سے بات چیت کے لیے مان گئے۔ 26 اپریل کو ارکانِ مشن نے مولانا آزاد سے ملاقات کی۔ انتقالِ اقتدار پیپرز جلد 7 اور وی پی مینن کے مطابق مولانا آزاد نے کہا کہ ''میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کو تین سطحی حل پر راضی کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا میرے خیال میں ورکنگ کمیٹی کو ایسے وفاق کے لیے راضی کر سکتا ہوں جو دو حصوں پر منقسم ہو اور ہر حصہ اختیاری شعبوں میں اپنے لیے قانون بنا سکتا ہو۔'' لیکن جب 27 اپریل کو وفد نے لیگ اور کانگریس کو سکیم (الف) کے مطابق تین سطحی حل کے لیے مذاکرات کے دعوت نامے جاری کیے تو مولانا آزاد نے جواب میں لکھا ''کانگریس نے کبھی بھی برطانوی ہند کو مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں تقسیم کیے جانے کو تسلیم نہیں کیا۔'' یعنی دوسرے دن ہی مولانا آزاد اپنی بات سے ہٹ گئے۔ لگتا ہے ارکانِ وفد سے مولانا نے جو

کچھ کہا وہ ان کی ذاتی حیثیت تھی۔ اور اب وہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بول رہے تھے۔

28اپریل کو مشن نے مولانا کو جواب دیا کہ دعوت نامے میں جو تجویز دی گئی ہے وہ محض تصفیے کی بنیاد پر ہے لازمی شرط نہیں ہے۔ اس کے جواب میں مولانا آزاد نے پھر وہی بات کی کہ ہم وفاق کے اندر صوبوں کے گروپ وہ بھی مذہبی بنیادوں پر بنانے کو انتہائی غلط سمجھتے ہیں۔" وہی میں (مولانا آزاد) اور ہم (کانگریس)۔

5.3 مئی سے شملہ میں ارکانِ وفد اور وائسرائے کی مسلم لیگ اور کانگریس کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ اس بات چیت کا محور وہی حل (الف) تھا۔ صبح و شام کے اجلاس میں وفاق میں اسمبلی، اس کے ارکان کی تعداد اور ایگزیکٹو اور اس کے ارکان کی تعداد بارے بات چیت ہوتی رہی۔ اس دوران کانگریسی نمائندوں جس میں خود مولانا آزاد بھی تھے، تین سطحی حل پر کوئی اعتراض نہ کیا اور نہ ہی گروپنگ پر بات کی۔ مگر 6 مئی کو وفد کے نام مولانا آزاد کا خط پہنچا۔ یہ خط انتقالِ اقتدار پیپرز جلد 7 میں موجود ہے جس میں مولانا آزاد نے لکھا۔

"میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم صوبوں کے گروپ یا وفاق کے حصوں کی سطح پر قانون ساز ادارے یا ایگزیکٹو کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں۔ ہم مجلسِ قانون ساز یا ایگزیکٹو میں گروپوں اور فرقوں کے درمیان برابری کو بھی قبول نہیں کرتے۔"

4. ان حالات میں جب بات گروپس پر رک گئی تو وائسرائے اور ارکانِ وفد نے گاندھی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ 6 مئی کو ہی وہ گاندھی سے ملے اور گاندھی کا یہ جواب سن کر سب مایوس ہوگئے کہ ''یہ سکیم تو پاکستان سے بھی بدتر ہے۔''

8.5 مئی کو وفد کی جانب سے گروپنگ سکیم کا تحریری خط دونوں پارٹیوں لیگ اور کانگریس کو ارسال کیا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''وفاق کی قانون ساز اسمبلی اور ایک حکومت ہو گی جس کے پاس خارجہ، دفاع، مواصلات اور بنیادی حقوق کے شعبے ہوں گے۔ باقی شعبے صوبوں کے پاس ہوں گے۔ صوبے گروپ بنا سکیں گے اور ہر گروپ کی اپنی ایگزیکٹو اور اسمبلی ہو گی۔ وفاق کی اسمبلی اور حکومت میں ارکان کی تعداد مسلم اکثریتی اور ہندو اکثریتی صوبوں سے برابری کی بنیاد پر لی جائے گی۔ ہر گروپ یا صوبے کو دس سال بعد اور پھر ہر دس سال بعد آئین میں تبدیلی پر نظرِ ثانی کا حق ہو گا۔ جب آئین بن جائے گا تو پھر صوبوں کو گروپ بدلنے کا اختیار ہو گا۔'' اس کے جواب میں مولانا آزاد کا خط 9 مئی کو مشن کو موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا۔ ''ہم صوبوں کے گروپوں کو منظور نہیں کرتے اور ایگزیکٹو اور آئین ساز اسمبلی میں برابری کے بھی سخت خلاف ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ میں رضا مندی کے لیے ثالثی کا طریقہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح مرکز کے پاس تین شعبوں کے علاوہ کسٹمز اور کرنسی بھی ہو۔''

16.6 مئی کو کابینہ مشن پلان شائع ہوا۔ جس پر پہلا ردّ عمل گاندھی کا آیا۔ انہوں نے 17 مئی کو اپنے اخبار ہریجن میں کہا۔ ''اگرچہ مشن نے کوشش کی مگر وہ تصفیے میں ناکام ہو

گیا۔ انہوں نے جو پلان دیا ہے وہ آئین ساز ادارے کو قابلِ قبول ہوں گی۔ یہ ادارہ ان سفارشات میں ترمیم، تنسیخ یا اصلاح کرنے کا مجاز ہو گا۔ اگر اس پر پابندیاں لگائی گئیں تو اس کی آزادانہ حیثیت متاثر ہو گی۔ مرکز کو حاصل شعبوں میں تبدیلی اسمبلی میں موجود ہندو یا مسلم ارکان کی اکثریت کی مرضی سے ہو سکے گی۔ یہی حال گروپنگ کا ہے۔ صوبے گروپ میں شامل ہونے یا اسے رد کرنے میں آزاد ہوں گے۔ اور کسی صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف کسی گروپ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔'' مولانا آزاد ''آزادیِ ہند'' میں فرماتے ہیں کہ پہلے پہل آسام کے کانگریسی لیڈروں نے گروپنگ سے انکار کیا پھر گاندھی بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کابینہ مشن پلان کے شائع ہونے کے دوسرے دن ہی وہ گروپنگ کے مخالف تھے۔

20.7 مئی کو مولانا آزاد نے کابینہ مشن پلان کے متعلق بطور صدرِ کانگریس اپنا ردِ عمل خط میں ظاہر کیا۔ انہوں نے لکھا کہ ''آئین ساز اسمبلی آئین بنانے میں خود مختار بھی ہو گی اور ہر بیرونی اثر سے آزاد بھی۔ اسمبلی جس مسئلے پر چاہے گی غور کرے گی اور اپنی مرضی سے فیصلہ دے گی۔ اتنا ہو سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ میں ہر دو فرقوں کے ارکان کی اکثریت فیصلہ دے گی۔ یعنی کوئی گروپنگ نہیں۔

26.8 مئی کو گاندھی کا ایک مضمون ان کے اخبار ہریجن میں چھپا۔ اس کی ایڈوانس کاپی وفد کو 20 مئی کو مل چکی تھی۔ اس میں پلان کے متعلق انہوں نے لکھا۔ ''یہ اپیل اور مشورہ ہے۔ کوئی جبر نہیں۔ صوبائی اسمبلیاں اور ارکان چاہیں تو مرکزی اسمبلی کے ارکان

منتخب کریں چاہیں تو نہ کریں۔ اسمبلی کوئی اور صورت بھی وضع کر سکتی ہے۔ قانونی طور پر اس میں کچھ لازمی نہیں۔" گروپنگ کے متعلق انہوں نے لکھا۔"سکھ محب وطن پنجابی ہیں وہ کسی ایسے گروپ میں اپنی مرضی کے خلاف کیسے جائیں گے جو سندھ، سرحد اور بلوچستان پر مشتمل ہو۔ پھر سرحد کس طرح اپنی مرضی کے خلاف پنجاب کے ساتھ گروپ بنائے گا۔ آسام کیسے اپنی مرضی کے خلاف بنگال کے ساتھ گروپ بنائے گا۔ ہر گروپ کا کوئی بھی صوبہ چاہے تو اس گروپ میں شامل ہو چاہے تو نہ ہو۔" اوپر دیئے گئے مولانا آزاد کے خط اور گاندھی کے مضمون کا لبِ لباب ایک ہی ہے۔ یعنی مولانا کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی جو گاندھی نے کہا مولانا اس پر صرف مہرِ تصدیق ثبت کر دیتے تھے۔

24.9 مئی کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور کابینہ مشن پلان کے متعلق قرارداد پاس ہوئی۔ اس میں کہا گیا۔"ورکنگ کمیٹی پلان کی سفارشات سے متفق نہیں۔ اس کے خیال میں آئین ساز اسمبلی خود مختار ہو گی اور جب چاہے ترمیم و تبدیلی کر سکے گی۔ صرف فرقہ وارانہ مسئلے پر دونوں فرقوں کی اکثریت کی رائے درکار ہو گی۔ صوبے جس طرح گروپوں میں رکھے گئے ہیں یہ ایک طرح کا جبر ہے۔ وہ پہلے ہی اجلاس میں فیصلہ کر سکیں گے کہ وہ موجودہ گروپ میں رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔" کمیٹی کی اس قرارداد، مولانا آزاد کے 20 مئی کے خط اور گاندھی کے 26 مئی کے ہریجن کے مضمون میں کچھ بھی فرق نہیں۔ لگتا ہے ان سب کے پیچھے گاندھی کا ہی ذہن کام کر رہا تھا۔

25مئی کو وفد اور وائسرائے نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کی تردید کر دی اور کہا۔
''یہ سکیم پوری کی پوری اپنی حیثیت رکھتی ہے۔ صوبوں کو جن گروپس میں رکھا گیا ہے وہ شروع میں اس سے نہیں نکل سکتے۔ اس طرح آئین ساز اسمبلی اس میں کوئی تبدیلی دونوں پارٹیوں کی مشاورت سے ہی کر سکے گی۔''

10.10 جون کو مولانا آزاد اور نہرو اکٹھے ارکانِ وفد اور وائسرائے سے ملے۔ اس ملاقات کا احوال انتقالِ اقتدار پیپرز 7 میں درج ہے۔ اس ملاقات کے دوران نہرو نے کہا۔ ''عبوری حکومت کے اثرات آئین ساز اسمبلی پر پڑیں گے۔ کانگریس چاہے گی مضبوط مرکز ہو۔ وہ گروپ سسٹم ختم کر دے گی۔ جناح کی کوئی حیثیت نہیں۔ لیگ اور کانگریس آئین ساز اسمبلی کے متعلق متضاد رائے کی حامل ہیں۔'' یعنی اقتدار مل جائے پھر سب کچھ ہندو اکثریت کی منشاء کے مطابق ہو گا۔

14.11 جون کو مولانا آزاد نے عبوری حکومت کے ارکان کی تعداد کے متعلق وائسرائے کو خط لکھا۔ جس میں ایک بار پھر گروپنگ کے اصول کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اور تاثر دیا گیا کہ کانگریس کے لیے کابینہ مشن پلان ناقابل قبول ہے۔

23.12 جون کو وائسرائے کے معاون ایبل نے گاندھی کی معاون راجکماری امرت کور کو مولانا آزاد کا ایک خط دکھایا جو مولانا نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے علم میں لائے بغیر وائسرائے کو لکھا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مشن کانگریس اور لیگ کے درمیان

عبوری حکومت کے ارکان بارے بات چیت کر رہا تھا۔ مسلم لیگ چاہتی تھی عبوری حکومت میں کانگریس اپنے کوٹے سے کوئی مسلمان نامزد نہیں کرے گی۔ یہ سب گاندھی کے سوانح نگار پیارے لال نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ جبکہ اس خط کے متعلق نہرو کے پرسنل سیکرٹری ایم او متھائی نے اپنی کتاب ''نہرو کے زمانے کی یادیں'' میں لکھا ہے۔'' راجکماری امرت کور یہ خط لے کر گاندھی کے پاس آگئی اور گاندھی نے یہ خط اپنی لکھنے کی میز پر رکھ دیا۔ اسی دوران مولانا آزاد گاندھی سے ملنے آئے۔ گاندھی نے جب مولانا آزاد سے کسی ایسے خط کا پوچھا تو مولانا آزاد صاف مکر گئے۔ ''شاید مولانا آزاد چاہتے ہوں کہ کسی طرح کانگریس اور لیگ میں سمجھوتہ ہو جائے۔ مگر جب بات ظاہر ہو گئی تو انہیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ انکار کر دیں۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا وہ چاہتے تو صاف کہہ دیتے ہاں میں نے لکھا ہے۔ مگر یہی لگتا ہے کہ کانگریسی قیادت کے سامنے بولتے ہوئے ان کے پَر جلتے تھے۔

25.13 جون کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے 24 مئی کی مجوزہ متنازعہ تشریحات والی قرارداد کی منظوری دے دی۔ جس میں وہ گروپنگ اور آئین ساز اسمبلی پر اعتراضات کر چکی تھی۔ اس قراردار میں پھر کہا گیا۔ ''کانگریس کے لیے یہ پلان اس نصب العین کے خلاف ہے جس کے لیے وہ آزادی کی خواہاں رہی۔ مرکزی اختیار کو محدود کیا جانا اور گروپ بندی بڑے نقائص ہیں۔ یہ سرحد، آسام کے صوبوں اور سکھوں کے ساتھ نا انصافی ہو گی۔ اگر اس منصوبے کو کلیت میں دیکھا جائے تو مرکزی اختیارات میں توسیع سے اسے بہتر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کانگریس آئین ساز اسمبلی میں ایک آزاد، متحدہ اور جمہوری

ہندوستان کا آئین بنانے کے لیے شرکت کرے گی۔" یعنی دھاک کے تین پات۔ نہ گروپنگ، نہ تین شعبوں پر مشتمل وفاق۔ ہر توضیح اپنے مقصد کی۔

25.14 جون کی قرارداد کے ساتھ مولانا نے بطور صدر کانگریس ایک خط بھی وائسرائے کو بھیجا جس میں انہوں نے لکھا۔ " قانون ساز ادارہ اور اس کے کام کے طریقۂ کار سے متعلق مجلسِ عاملہ نے 24 مئی کو اپنی قرارداد کی منظوری دی تھی۔ پھر اس کے متعلق مشن کے ساتھ میری اور میرے ساتھیوں کی گفتگو اور خط و کتابت ہوتی رہی۔ جس میں ہم نے اپنے مطابق ان تجاویز کے نقائص واضح کیے تھے۔ ہم نے بعض شقوں پر اپنی توجیہ بھی دی۔ لہٰذا اپنے خیالات پر کاربند رہتے ہوئے ہم ان تجاویز کو منظور کرتے ہیں اور اپنے نصب العین کے حصول کے لیے اس پر عمل درآمد کے لیے تیار ہیں۔"

یعنی مانا بھی اور کچھ بھی نہ مانا۔ مشن پلان اس کی پوری سپرٹ کے ساتھ منظور نہیں بلکہ اپنی توجیہات کے ساتھ۔ یہ خط بینرجی اور بوس کی مرتب کردہ اور 1946ء میں شائع شدہ کتاب "کابینہ مشن ہندوستان میں" میں دیکھا جا سکتا ہے۔